DATE LABEL

l No. ____________

No. ____________ Date ____________

CENTRAL LIBRARY
THE UNIVERSITY OF KASHMIR

is book should be returned on or before the last date
nped above. An over-due charge of 10 Paise will be
ied for each day, if the book is kept beyond that date

جدید اِنتخاب

(نظم)

اُردو نصاب

منظور کردہ :- جموّں و کشمیر یونیورسٹی

ناشران

کپور برادرس بکسیلرز پبلشرز امیراکدل سرینگر

110 - 2

45010
3.1.63

جدید انتخاب

(نظم)

اردو نصاب

منظور کردہ:- جموں و کشمیر یونیورسٹی

ناشران

کپور برادرس بکسیلرز پبلشرز امیرا کدل سرینگر

قیمت دو روپیہ

891.431
U1
Z:248'Z:
CHECKED
JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY LIBRARY
No. 45010
Date 3.1.63
SRINAGAR
ALLAMA IQBAL LIBRARY
45010
ST 01

مہر کے بغیر کتاب چوری کا مال سمجھی جائے گی۔ کوئی صاحب اس کتاب کا
خلاصہ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر نہیں چھاپ سکتا۔

قیمت فی جلد دو روپیہ بارہ آنے

فهرست

نمبر شمار	صفحه	غزل / شعر	
۱	۴۱	[illegible]	۱۳
۲	۷۷	[illegible]	۱۵
۳	۸۱	[illegible]	۱۵
۴	۸۶	[illegible]	۱۶
۵	۹۲	[illegible]	[illegible]
۶	۹۸	[illegible]	۱۹
۷	۱۰۵	[illegible]	۲۰
۸	۱۱۳	[illegible]	۲۵
۹	۱۱۶	[illegible]	۲۶

پیش لفظ

آج تک انٹرمیڈیٹ اوپشنل کے لئے جس قدر بھی شعر و سخن سے متعلّق نصاب مُقرر کئے گئے۔ اِن میں سے بیشتر کسی نہ کسی حد تک تشنہ تھے جو طلبا کی صحیح ضرورتوں کو پُورا نہیں کر سکتے تھے۔ چند برس پہلے کتاب دیوان حالی نصاب میں شامل تھی۔ اوّل تو وہ کتاب اس قدر طولانی تھی کہ وقت پر ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے طلّبا کا مطالعہ صرف حالی تک محدود رہتا تھا اور وہ باقی شعر و ادب سے بالکل ناآشنا رہتے تھے۔ اس کمی کو پُورا کرنے کے لئے اِنتخاب زرّیں کا انتخاب کیا گیا۔ اس کتاب میں بلاشک تنوّع تھا مگر طول کے لحاظ سے یہ بھی کُچھ کم نہ تھی۔ اِس قدر قلیل فرصت میں جو اُردو اوپشنل کے حصہ میں آتی ہے۔ بہت سے غیر ضروری شعراء کی وجہ سے ساری کتاب کا ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ نصاب کی دوسری کتاب مقدمہ شعر و شاعری اور مضمون نویسی کی طرف بہت کم توجہ دی جا سکتی تھی۔ چناں چہ اس مقصد کے حصول کے لئے اساتذہ حضرات کو بہت سے شعراء کو سرے سے ہی نظر انداز کرنا پڑتا تھا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ قابل مؤلف نے اِنتخابِ زرّیں ہرگز ایک نصاب کے طور پر تالیف نہ کی تھی۔

یہی وہ اسباب تھے جو مؤلفین کو "جدید انتخاب نظم" پیش کرنے کے محرک ہوئے۔ جدید انتخاب نظم میں ہم نے بورڈ کی اس خواہش کو ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ طلبا کی شعر و ادب سے واقفیت اور علم بڑھے اس انتخاب میں ولی دکن سے لے کر جوش تک اُن پچیس شعراء کو چُنا گیا ہے۔ جو اُردو شعر و سخن میں انفرادی طور پر صاحب طرز کا درجہ رکھتے ہیں اس میں ہر شاعر کے کلام سے پہلے اُس کی سوانح حیات۔ ادبی کارہائے نمایاں اور خصوصیات شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیونکہ یونیورسٹی سلیبس کے مُطابق جہاں طلبا کے لئے شعرائے کرام کے کلام کے معانی و مطالب کا جاننا ضروری ہے۔ وہاں شاعر کے حالات زندگی محرکاتِ شعر اور کلام کے حُسن و قبح کا جاننا بھی لابدی ہے۔ یہ انتخاب صرف ایک صنف سخن کا حامل نہیں۔ بلکہ قریب قریب تمام اُردو اصناف سخن کی نمایندگی کرتا ہے، اور مختلف شعراء کے کلام کے اِقتباسات لیتے وقت اس امر کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ اِقتباس شاعر کی نمایاں خصوصیات کی واضح دلیل ہو، خُدا کرے اس انتخاب کے مطالعہ سے طلباء میں وہ ذوق شعر و ادب پیدا ہو سکے جس کی ان سے توقع کی جاسکتی ہے ⁂

مؤلفین

سوداؔ

مرزا محمدؔ رفیع نام اور سوداؔ تخلّص تھا۔ آپ ۱۷۱۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، اور وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ان کے والد میرزا یان کابُل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مرزا کے والد مرزا محمدؔ شفیع تجارت کرنے کے لئے ہندوستان آئے تھے۔ مرزا نے اِس رعایت سے سوداؔ تخلّص اِختیار کیا۔ شاہ حاتمؔ کے شاگردوں میں سے تھے۔ اِبتداء میں فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ایک دِن خان آرزو نے کہا کہ "مرزا فارسی اب تمہاری زبان نہیں۔ اِس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمہارا کلام اہلِ زبان کے مقابلے میں قابلِ تعریف ہو چونکہ تمہاری طبع موزون ہے۔ تم اُردو کہا کرو۔ تو یکتائے زمانہ ہو گے"۔ مرزا نے اُستادِ زمانہ کی نصیحت پر عمل کیا، اور شعر و سخن میں قبول عام حاصل کیا، اور دِلّی ایسے شہر میں یکتائے روزگار بن کر چمکے۔ شاہ عالم کے کلام کی اِصلاح بھی کرتے رہے چونکہ بڑے غیور اور نازک مزاج تھے۔ اِس لئے ایک دِن بادشاہ سے ناراض ہو کر بُلانے کے باوجود نہ گئے۔ نواب شجاع الدولہ نے انہیں لکھنؤ بُلا بھیجا۔ مگر انہیں دِلّی چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ اِس لئے یہ رُباعی لکھ کر بھیج دی:-

سوداؔ پئے دُنیا تو بہر سُو کب تک؟ آوارہ ازیں کوچہ باں کُو کب تک؟
حاصل یہی اس سے نا کہ دُنیا ہووے بالغرض ہوا یُوں بھی تو پھر کب تک؟

مگر جب زمانہ بدل گیا اور دہلی میں قدر دانوں کا فقدان کم ہو گیا تو سوؔدا گھبرائے۔ ۶۵ برس کی عُمر میں دہلی کو چھوڑنا پڑا۔ اور نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی۔ مگر وہاں بھی اپنی نازک طبع کی وجہ سے زیادہ عرصہ نہ نبھ سکی۔ شجاع الدّولہ کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے آصف الدّولہ نے مرزا کے لئے معقول وظیفہ مقرر کر دیا جس سے آخری ایّام تک فارغ البالی سے بسر ہوتی رہی اور ستّر برس کی عُمر پا کر سنہ ۱۷۸۱ء میں انتقال کیا۔

سوؔدا اپنے زمانے کے مسلّم الثبوت اُستاد تھے۔ زبان پر پُوری قدرت رکھتے تھے۔ نازک خیالات اور تازہ مضامین باندھتے تھے۔ تمام اصناف سخن پر قُدرت رکھتے تھے۔ اُردو قصیدہ میں وہ جوہر دکھائے کہ اسے فارسی کا ہم پلّہ بنا دیا۔ غزل اور قصیدہ کے علاوہ ہجو گوئی میں خُوب مہارت تھی۔ جن لوگوں نے اُردو کو پاک اور صاف کیا۔ اِن میں مرزا کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔

(۱)

مقدور نہیں اُس کی تجلّی کے بیاں کا — جُوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعیّن کے درِ دل سے اُٹھا دے — کُھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ — جوں شمع حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا

اِس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن — جب چشم کُھلی گُل کی تو موسم ہے خزاں کا

دِکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنس گراں کا

سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سُنے تو
مضمونِ یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دُنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

(۲)

کرتا ہوں سیر جب سے باغ جہاں بنایا
کیا جانے گُل خُدا نے تجھ سا کہاں بنایا

اِک نام تو سُنا ہے دیکھا نہیں کسُو نے
حق نے نشانِ عنقا تیرا دہاں بنایا

جتنے ہیں خُوب رویاں سب دلستاں ہیں لیکن
اللہ نے تجھی کو اک جاں ستاں بنایا

جنسِ دوم کو اوّل بزاز کھولتا ہے
یوسف سے تو یہاں ہیں تجھ کو گراں بنایا

دیر و حرم کو دیکھا۔ اللہ رے فضولی
یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا

تُو مت بگاڑ اُس کو اے باغباں! کہ ہم نے
نزدیک آتش گُل آپ آشیاں بنایا

عالم کا قمری آسا ہے طوق بندگی کا
قامت کو تیرے جیسے سروِ رواں بنایا

اکثر نشاں بنے ہیں عالم میں نام خاطر
تُو نے سخن کو سودا اپنا نشاں بنایا

(۳)

نے بُلبُلِ چمن نہ گُلِ نو دمیدہ ہوں
میں موسمِ بہار میں شاخ بریدہ ہوں

گریاں بہ شکلِ شیشہ و خنداں بہ طرزِ جام
اِس مے کدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں

کوئی جو پوچھتا ہو تو کس پہ ہے دلخواہ
جُوں گُل ہزار جا سے گریباں دریدہ ہوں

تیغ نگاہ چشم کا تیرے نہیں حریف
ظالم میں قطرۂ مژۂ خوں چکیدہ ہوں

کس سے کروں میں دعوئ دِل جا کے اے خُدا
دلدادۂ زُلف رُخ دِلبر ندیدہ ہوں

کرتا ہے جا کے گُل کی تسلی چمن میں تُو
خُونِ جگر میں ہیں بھی تو دامن کشیدہ ہوں

غافل ہے کیوں تو اے مری فرقت سے گوشِ دل — اے بے خبر میں نالۂ حلقِ بریدہ ہوں

میں کیا کہوں کہ کون ہوں سوداؔ بقول درد
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

(۴)

دل نا آشنائے نالہ سے صد رہ جرس بہتر — نہ ہوں مژگاں جو خوں آغشتہ ان سے خار و خس بہتر
نہ دیکھی خوشدلی جز بابِ تبسّم ہم نے غنچے میں — ہوا سے اس چمن کی ہے دلا! ترکِ ہوس بہتر
وفا نے گل ہیں نے چشمِ مروّت باغباں میں ہے — نکل بلبل! کہ ہے اس باغ سے کنجِ قفس بہتر
نظر میں ان کی جن کو دولتِ استغنا نے بخشی ہے — مگس سے ہے ہما بہتر ہما سے ہے مگس بہتر
بلند آتش جہاں ہووے ہوائے جنبشِ لب سے — تو اپنی فہم ناقص میں ہے واں ضبطِ نفس بہتر
بگردِ دل ہے طوفِ کعبہ سے نزد اپنے اے منعم — بسانِ دانہ ہائے سبحہ پھرنا پیش و پس بہتر

کہے ہے دیکھ کر شانے کو یہ سودائے دیوانہ
شبِ تاریک میں تنہا نہیں گشت اے عسس بہتر

(۵)

قصیدۂ بہاریہ

اوٹھ گیا بہمن و دی کا چمنستاں سے عمل — تیغ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل
جوششِ روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں — شاخ میں گاؤ زمیں کے ہے جو پھوٹے کونپل
دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک — دیں ہیں قسمِ جمادات سے شاید ہو خلل

فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زبان سے اپنی — کہیں دعوئ خدائی نہ کریں لات و ہبل

سبز ہوتا ہے فصیحی کے سبب سے ہر بار — جو زبان سے سخن اب طوطی کے آتا ہی نکل

دست گل خوردہ و شاخ گل و گلزار بہم — بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل

غنچہ پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ — گل بہم پہنچے ہے غنچہ ہو کسی طرح کا حل

آوے ہے اُن کے نظر لاکھ طرح کا وہ پھول — اون گلون چھٹ جو نگہ کے ہیں سدا مستعمل

یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزان سے مانا — چاہتی ہے بسماجت کرے سبزے سے بدل

چشم نرگس کی بصارت کی زبس ہے درپے — غنچۂ لالہ نے سُرمہ سے بھری ہے مکحل

اِس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح — چشم سیار گلستان میں جھپکتی نہیں پل

آبجو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے — خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول

سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر — ساغرِ لعل ہیں جوں کیجئے زمرّد کو حل

سنگ نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا — تیغ کہسار ہوئی بسکہ ہوا سے صیقل

برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے — گُل کو دیکھو تو نگہ جا رہے سنبل پہ پھسل

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیابان میں نسیم — پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

اتنی ہے کثرت لغزش بزمین ہر باغ — جو ثمر شاخ سے اُترا سو گرا سر کے بل

فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے — شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل

دانہ جس شور زمین سے نہ پھلا دہقاں سے — سبز واں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل

کشت کرتے ہیں ہر ایک تخم سے از فیض ہوا — گرتے گرتے بزمین برگ و بر آتا ہی نکل

سبز فام اِن دنوں آتا ہے نظر ہر گُل رو — خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزند مغل

جوہری کو چمنستانِ جہاں میں اس فصل — آ گیا لعل و زمرّد کے پرکھنے میں خلل

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی
اخگر از فیضِ ہوا سبز شود در منقل

میر دردؔ

نام محمّد میر اور دردؔ تخلّص کرتے تھے۔ آپ ۱۱۳۳ھ مطابق ۱۷۱۹ء میں دِلّی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان دِلّی میں پیری اور مریدی کی وجہ سے نہایت عزّت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ آپ اُردو کے چار رُکنوں میں سے ایک رُکن ہیں۔

آپ کے کلام میں تصوّف اور معرفت کا رنگ نمایاں ہے۔ کلام میں سنجیدگی اور متانت کا عنصر خاص طور پر ملتا ہے۔ اُردو غزل میں عارفانہ رنگ بھر کر میر دردؔ نے اِس صنف کو فارسی غزل کا ہم پلّہ بنا دیا۔ دردؔ نے اکثر غزلیں چھوٹی بحریں کہیں اور اُن میں سات یا نو اشعار رکھے۔

آپ کا شُمار بارھویں صدی کے اولیاء میں ہوتا ہے، اور تصنیف و تالیف کا شوق خُداداد تھا۔ جو آخر وقت تک رہا۔ آپ کا اِنتقال ۱۱۹۹ھ میں دِلّی میں ہوا۔ کسی مُرید نے تاریخ کہی ہے ؏

"حیف دُنیا سے سِدھارا وہ خُدا کا محبوب

غزلیات

(۱)

اکسیر پہ ہوس اتنا نہ ناز کرنا
بہتر ہے کیمیا سے دل کا گداز کرنا!

کب دل ملے کسی کا ہم غمزدوں سے کھل کر
ہے اپنے دل سے لازم جوں غنچہ ساز کرنا

اے آنسوؤ! نہ آوے کچھ دل کی بات منہ پر
لڑکے ہو تم۔ کہیں مت افشائے راز کرنا

تو اپنے ہاتھوں آپ ہی پڑتا ہے تفرقہ میں
اے امتیاز ناداں ٹک امتیاز نہ کرنا

ہم جانتے نہیں ہیں اے دردؔ کیا ہے کعبہ؟
جیدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا

(۲)

جگ میں آکر ادھر اُدھر دیکھا
تُو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تُو نے آنکھ بھر دیکھا

نالہ، فریاد، آہ اور زاری
آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

اِن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سَو سَو طرح سے مر دیکھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی
دردؔ کو قصّہ مختصر دیکھا

(۳)

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت مصیبت ملامت بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں
کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
اِدھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

حجاب رخ یار تھے آپ ہم ہی
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے درد درپے ہو اُس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

(۴)

مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
اُفتادہ ہوں یہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثل صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ میں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں

چاہے ہے یہ تو تپشِ دل کہ بعد مرگ
کُنجِ مزار میں بھی نہیں آرمیدہ ہوں

اے دردؔ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غمزدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

(۵۱)

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تُو سما سکے

وحدت میں تری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے مُنہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اُٹھا سکے

قاصد! نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل! خُدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھُلا سکے

یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول
دل سے اُٹھا خلاف اگر تو اُٹھا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بےخود ہے جس کو حشر
اے دردؔ چاہے لائے بخود پھر نہ لا سکے

رُباعیات

(۱)

ہمارے جامۂ تن میں نہیں کچھ اور بس باقی
گریباں میں ہے مثلِ صبح اک تارِ نفس باقی
یکایک عشق کی آتش کا شعلہ اس قدر بھڑکا
نہ چھوڑا سرزمینِ دل میں کوئی خار و خس باقی

(۲)

پیدا کرے ہر چند تقدّس بندہ
مُشکل ہے کہ ہو حرص سے دِل برکندہ
جنّت میں بھی اکل و شرب سے کب ہے نجات
دوزخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندہ

میر حسنؔ

نام میر غلام حسن اور حسنؔ تخلّص تھا۔ میر صاحب کے بیٹے اور میر انیسؔ کے دادا تھے۔ بزرگوں کا اصلی وطن ہرات تھا۔ ۱۷۲۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں اپنے والد سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ بعد میں سوداؔ اور پھر میر دردؔ سے استفادۂ سخن حاصل کیا۔ دہلی کے اُجڑ جانے کے بعد فیض آباد چلے گئے اور ۱۷۷۵ء میں پھر لکھنؤ واپس آ گئے اور ۱۷۸۹ء میں وہیں انتقال کیا۔

آپ کا کلام نہایت سلیس اور صاف ہے۔ غزل، رُباعی مثنوی اور مرثیہ سبھی خُوب کہتے تھے۔ مگر مثنوی میں کمال حاصل تھا۔ آپ کی مثنویِ سحر البیان بہت مشہور ہے جس کے مقابلے میں سادگی اور منظر کشی کے لحاظ سے آج تک کوئی مثنوی نہیں کہی گئی ہے۔ اس مثنوی کی زبان صاف اور بامحاورہ ہے۔ دلچسپی شروع سے لیکر آخر تک قایم رہتی ہے۔ مناظرِ قدرت کی تصویر کشی اور شادی و غم کے جذبات کا بیان نہایت خوبی سے کیا ہے۔ اک تذکرہ شعرائے اُردو۔ ایک دیوان اور گیارہ مثنویاں بطور تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔

شہزادے کی باغ میں جانے کی تیاری

(۱)

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ
ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان
لگے جس میں زربفت کے سائبان

چھتیں اور پردے پڑے زرنگار
دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا
کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا پڑا

وہ مقیش کی ڈوریاں سربسر
کہ مہ کا بندھا جس سے تار نظر

چھتوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال
نگہ کو وہاں سے گُزرنا محال

سنہری مغرّق چھتیں ساریاں
وہ دیوار اور در کی گُل کاریاں

دیئے ہر طرف آئینے جو لگا!
گیا چوگنا لُطف اُس میں سماں

وہ مخمل کا فرش ایسا ستھرا کہ بس
بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

رہیں لخلخے اس میں روشن مدام
معطّر شب و روز جس سے مشام

چھپر کھٹ مُرصّع کا دالان میں
چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں

زمیں پر تھی اس طور اسکی جھمک
ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

زمیں کا کروں اس کی کیا میں بیاں
کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں

بنی سنگ مَرمَر کی چوپڑ کی نہر
گئی چار سُو اس کے پانی کی لہر

قرینے سے گرد اس کے سرو سہی — کچھ اک دور دور اس سے سیب و بہی
کہوں کیا میں کیفیتِ دار بست — لگائے رہیں تاک واں مے پرست
ہوائے بہاری سے گل لہلہے — چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے
زمرد کے مانند سبزے کا رنگ — روش پر جواہر لگا جیسے سنگ
روش کی صفائی پہ بے اختیار — گل اشرفی نے کیا زر نثار
چمن سے ہرا باغ، گل سے چمن — کہیں نرگس و گل، کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا — کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبّو کے ہر جا نشاں — مدن بان کی اور ہی آن بان!
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار — جدی اپنے موسم میں سب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں — سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی ہیں گلوں کی بہار — کہ ہر اک سفیدی سے مہتاب دار
کھڑے سرو کی طرح چمپے کے جھاڑ — کہے تو کہ خوش بوئیوں کے پہاڑ
کہیں زرد نسرین، کہیں نسترن — عجب رنگ یہ زعفرانی چمن
پڑے آب جو ہر طرف کو بہے — کریں قمریاں ہر طرف چہچہے
گلوں کا لبِ نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں مُنہ چومنا
وہ جھُک جھُک کے گرنا خیابان پر — نشے کا سا عالم گلستان پر
لئے ہاتھ میں بیلچے مالنیں — چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں

کہیں تخم پاشی کریں کود کر
پنیری جماویں کہیں کھود کر

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال

لبِ جو پہ آئینے ہیں دیکھ قد
اکڑنا کھڑے سرو کا جد و قد

خراماں صبا صحن میں چار سُو
دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بُو

کھڑے نہر پر قازہ اور قرقرے
لئے ساتھ مُرغابیوں کے پرے

صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور

چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول
پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول

وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھاؤں
لگی جائیں آنکھیں لئے جس کا ناؤں

خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں
تعشق کی آپسمیں باتیں کریں

درختوں نے برگوں کے کھولے ورق
کہ لیں طوطیاں بوستاں کا سبق

سماں قمریاں دیکھ اس آن کا
پڑھیں باب پنجم گلستان کا

خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم
محل کی وہ چہلیں وہ آپس کی دھوم

تکلف کے پہنے پھریں سب لباس
رہیں رات دِن شاہ زادے کے پاس

کنیزانِ مہ رُو کی ہر طرف ریل
چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل

رنگیلی کوئی اور کوئی تمام رُوپ
کوئی چت لگن اور کوئی کام رُوپ

کوئی کیتکی اور کوئی گلاب
کوئی مہر تن اور کوئی ماہ تاب

Acc. No. ...

کوئی سیوتی اور ہنس مکھ کوئی — کوئی دِل لگن اور تن سُکھ کوئی
اِدھر اور اُدھر آتیاں جاتیاں — پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں
کہیں اپنے بیٹے سنوارے کوئی — اری اور ری سیلی، پکارے کوئی
کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں — کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں
لجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے — کہیں واہ وا اور کہیں واچھڑے
دکھاوے کوئی گوکھرو موڑ موڑ — کہیں سوت بوٹے کہیں تار توڑ
ادا سے کوئی بیٹھ حقہ پیئے — دمِ دودستی کوئی بھر بھر جیئے
کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے — کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلائے
کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر — کوئی اپنی مینا پہ رکھے نظر
کسی کو کوئی ڈھول مارے کہیں — کوئی جان کو اپنی وارے کہیں
کوئی آرسی اپنے آگے دھرے — ادا سے کہیں بیٹھی کنگھی کرے
مقابہ کوئی کھول مسّی لگائے — لبوں پر دھڑی کوئی اپنے جمائے
ہُوا ان گلوں سے وہ بالا سماں — اِسی باغ میں تھا وہ سرور واں

غرض لوگ تھے یہ جو ہر کام کے
یہ سب واسطے اس کے آرام کے

(۲)

غمِ ہجر کا بیان

بدن کو جو دیکھا تو زار و نزار / کسی کو کوئی دیوے جیسے فشار
زباں پر ہیں باتیں ولے دل اُداس / پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ مُنہ کی خبر اور نہ تن کی خبر / نہ سر کی خبر نے بدن کی خبر
اگر سر کھُلا ہے تو کچھ غم نہیں / جو کرتی ہے میلی تو محرم نہیں
جو مستی ہے دو دن کی تو ہے وہی / وہ کنگھی نہیں کی تو یوں ہی سہی
جو سینہ کھُلا ہے تو دل چاک ہے / غم آلودہ صُبحِ طربناک ہے!
نہ منظور سُرمہ نہ کاجل سے کام / نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام
ولیکن یہ خوبوں کا دیکھا سبھاؤ / کہ بگڑے سے دونا ہو ان کا بناؤ
جو ماتھے پہ چینِ جبیں غم سے ہے / تو وہ بھی ہے اک موج دریائے مے
وہ آنکھیں جو روتی ہیں بس پھوٹ پھوٹ / تو گویا کہ موتی بھرے کوٹ کوٹ
گریبان سینہ پہ جو ہے کھُلا / تو گویا ہے وہ صُبحِ عشرت فزا
نقاہت سے چہرہ اگر زرد ہے / دیا آہ ہونٹوں پہ کچھ سرد ہے

ادا سے نہیں یہ بھی عالم جُدا
کہ ہے چاندنی اور ٹھنڈی ہوا

میرؔ

میر محمد تقی نام اور میرؔ تخلص تھا۔ ۱۱۲۷ھ میں اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد علی متقی شرفائے اکبر آباد میں سے تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد میرؔ دہلی چلے گئے، اور وہاں اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزوؔ کے پاس پرورش پائی۔ ابتداء میں اشعار کی اصلاح خان آرزوؔ ہی سے لیتے تھے۔ شعر و سخن کا ملکہ خدا داد تھا۔ چنانچہ اس کی بدولت جلدی دُنیائے سخن میں آفتاب بن کر چمکے۔ آپ کی غزلیں مسافر ایک شہر سے دوسرے شہر تک بطور تحفہ لے جاتے تھے۔ دِلّی کے زوال کے بعد میر لکھنؤ آئے اور نواب آصف الدولہ نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ تین سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ مگر میرؔ اپنی نازک مزاجی اور بد دماغی کی وجہ سے یہ ذریعہ معاش بھی کھو بیٹھے، دربار میں آنا جانا بند کر دیا۔ زندگی کے آخری ایّام تنگی اور عسرت میں بسر کرتے رہے۔ فقر و فاقہ اختیار کر لیا۔ مگر دستِ سوال دراز نہ کیا۔ سَو برس کی عمر پا کر ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں انتقال کیا۔ ناسخؔ نے تاریخ کہی :- "واویلا مُردشہ شاعراں"

میرؔ کی ساری زندگی غم و یاس کا ایک مُرقع ہے۔ انہیں

ایک سے ایک صدمہ پہنچتا رہا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے کلام میں حسرت مایوسی اور ناکامی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اس رنگ شعر نے میرؔ کے کلام کو چمکا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ کے اشعار نشتر کا کام کرتے ہیں۔ میرؔ غزل کے میدان کے شہسوار ہیں۔ اُن کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی مثال آپ ہے۔ چنانچہ ناسخؔ، غالبؔ اور ذوقؔ نے بھی ان کی قادر الکلامی کا اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے۔ میرؔ کی غزلوں کے چھ دیوان ہیں۔ جن میں سترہ ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ مگر ان میں بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ "کہتر ش" "کہترین" کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر اس میں ہرگز شک اور مبالغہ نہیں کہ "بہتر ش" "بہترین" بھی ہے۔

غزلیات

(۱)

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دِل کے جانے کا نہایت غم رہا

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک
قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا

سُنتے ہیں لیلےٰ کے خیمہ کو سیاہ
اس میں مجنوں کا مگر ماتم رہا

جامۂ احرامِ زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

صُبح پیری شام ہونے آئی میرؔ
تُو نہ چیتا اور بہت دِن کم رہا

(۲)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبکِ دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسمِ گُل ہم کو تہہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تُو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیقِ جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دستِ نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

(۳۱)

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں
بانکے، ٹیڑھے، ترچھے، تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کے اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام؟
کوچہ کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانہ میں
جُبّہ، خرقہ، کُرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا

کاش اب برقعہ منہ سے اُٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل
آنکھ مندے پر اُن نے گر دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے تو اتنا ہے
رات کو رو رو صُبح کیا یا دن کو جُوں تُوں شام کیا

صُبح چمن میں اُس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گُل کو مول لیا قامت سے سرو غلام کیا

ساعد سمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگنی ان نے جوں جوں میں ابرام کیا

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میؔر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

(۱۴)

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشم مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے
آگے اس متکبر کے ہم خدا خدا کیا کرتے ہیں کو
کب موجود خدا کو وہ مغرور خود آرا جانے ہے
عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے
چارہ گری بیماریٔ دل کی رسم شہر حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے
کیا ہی شکار فریبی پر مغرور ہے وہ صیاد بچہ
طائر اڑتے ہوا میں سارے اپنا اسارا جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت اک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے
عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ اٹھتا ہے دیکھے سے اس کے
یار کے آ جانے کو یکایک عمر دوبارا جانے ہے
کیا کیا آفتیں سر پر اس کے لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے
رخنوں سے دیوار چمن کے منہ کو لے ہے چھپا لیتی

اِن سوراخوں کے تنک رہنے کو سو کا نظارا جانے ہے
تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دمدار آبِ تیغ کو اس کے آب گوارا جانے ہے

(۵)

کرو توکّل کہ عاشقی میں نہ یُوں کرو گے تو کیا کرو گے
الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تلک تم دوا کرو گے
جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ دردِ ہجراں سے مرتے رہیئے
ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کرو گے
جہاں کی مسلخ تمام حیرت نہیں ہے تس پر نگہ کی فرصت
نظر پڑیگی لبانِ بسمل کبھو جو مژگاں کو وا کرو گے
اخیر اُلفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہوئے پتنگے
ہوا جو یاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہو کر اُڑا کرو گے
ملا ہے ایسا طبیبِ دل کہ صبر اس پر ہے سخت مشکل
دماغ اتنا کہاں رہے گا کہ دستِ بر دل رہا کرو گے
عدم میں ہم کو یہ غم رہیگا کہ اوروں پر اب ستم رہیگا
تمہیں تو لت ہے ستانے ہی کی کسو پہ آخر جفا کرو گے
اگرچہ اب تو خفا ہو لیکن موئے گئے پر کبھو ہمارے

جو یاد ہم کو کرو گے پیارے تو ہاتھ اپنے ملا کرو گے
سحر کو محرابِ تیغ قاتل کبھو جو یارو ادھر ہو مائل
تو ایک سجدہ بزبانِ بسمل مری طرف سے ادا کرو گے
غمِ محبّت سے میرؔ صاحب بہ تنگ ہوں میں فقیر ہو تم
جو وقت ہوگا کبھی مساعد تو میرے حق میں دُعا کرو گے

اِنشاؔ

سید انشا اللہ خان نام اور انشاؔ تخلّص تھا۔ آپ کے والد کا نام میر ماشا اللہ خان تھا۔ آپ کے بزرگ نجف سے آکر دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔ اور اپنی حُسن لیاقت سے شاہی امرا میں شمار کیے جاتے رہے۔ انشاؔ نے علوم رسمیہ اپنے والد سے ہی حاصل کیے۔ والد شاعری بھی کرتے تھے، اور مصدرؔ تخلّص اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ابتدا میں اصلاح سخن انہیں سے لیا کرتے تھے۔ انشاؔ شاعر ہونے کے علاوہ بڑے ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ دِلّی کی تباہی کے بعد انشاؔ بھی دوسرے شعراء کی طرح لکھنؤ چلے گئے۔ پہلے شہزادہ میرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کی اور بعد میں نواب سعادت علی خان نواب اودھ کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔

نواب اودھ آپ سے اس قدر مانوس ہوئے کہ دم بھر کی جدائی بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ مگر انشؔا کی خوش طبعی کا انجام اچھا نہ نکلا۔ نواب صاحب کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ اور اُن کو اپنا آخری وقت بد حالی میں گزارنا پڑا۔ آپ نے ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء میں انتقال کیا۔

اِن میں علمی جامعیت اور قابلیت بڑی تھی۔ کلام میں جدّت اور طرز بیان میں ایک خاص لُطف نمایاں ہے۔ اُنھوں نے اُردو میں سب سے پہلے صرف و نحو تیار کی۔ دریائے لطافت میں عروض معانی و بیان نہایت عمدگی سے پیش کئے ہیں۔ کلیاتِ انشؔا علم و ادب کا ایک عجیب مرقع ہے۔ جس میں عجیب عجیب موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ کوئی ایسا رنگ نہیں جو ان کے کلام میں موجود نہیں +

(۱)

قصیدہ بہاریہ

بگھیاں پھولوں کی تیار کرا لے بوئے سمن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

عالم اطفال نباتات پہ ہوگا کچھ اور
گودرے کالے سبھی بیٹھیں گے کپڑے پہن

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
کرسئی ناز پہ جلوے کی دکھائیگا پھبن

نسترن بھی نئی صورت کا دکھائیگا رنگ
کوچ پر ناز کی جب پاؤں رکھیگا بن ٹھن

اپنے گیلا اس شگوفے بھی کرینگے حاضر
آکے جب غنچہ و گل کھولینگے تونل کا دہن
اور یہی جلوے نگاہوں کو لگیں گے دینے
اودی بانات کی کرتی ہے شگوفے سوسن
پتے ہل ہل کے بجا دینگے فرنجی طنبور
لالہ لاوے گا سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچکر تار رگِ ابرِ بہاری سے کئی
خود نسیم سحر آئے گی بجاتی ارگن
اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلاوینگے
آپڑے گی جو کہیں نہر پہ سورج کی کرن
آئیگا نظر کو شیشے کی گھڑی لیکے حباب
یاسمیں پتوں کی پہنیں ہیں چلیگی بن ٹھن
نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرہ
ساتھ ہولے گی نزاکت بھی جو ہے اسکی بہن

غزلیات

(۲)

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب اُلٹا
عجب اُلٹے مُلک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا
چلے تھے حرم کو، رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق

نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب اُلٹا
یہ شبِ گزشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا
کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب اُلٹا
ابھی جھڑ لگا دے بارش، کوئی مست پڑھ کے نعرے
جو زمیں پہ پھینک مارے قدحِ شراب اُلٹا
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا
ہوئے وعدے پہ جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور
اے لو دیکھو یہ تماشا یہ سُنو عتاب اُلٹا
کھڑے چُپ ہو دیکھتے کیا مرے دِل اُجڑ گئے کو
وہ گُنہ تو کہدو جس سے یہ ہوا خراب اُلٹا
غزل اور قافیوں میں نہ کہے تو کیوں کہ انشاؔ
کہ ہوا نے خود بخود آ۔ ورقِ کتاب اُلٹا

(۳۳)

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیّار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی

تجھے اٹھکھیلیاں سُوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں
بسانِ نقشِ پائے رہ رواں کوئے تمنّا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں!
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمّل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

نظیرؔ

ولی محمدؔ نام اور نظیرؔ تخلّص تھا۔ آپ کا اصلی وطن دہلی تھا مگر جب دِلّی تباہ ہوگئی تو نظیرؔ دِلّی چھوڑ کر اکبر آباد میں سکونت پذیر ہوئے۔ روضۂ تاج گنج کے قریب سکونت اختیار کی اور معلّمی کے پیشے کو اپنایا۔ شاعری میں کسی کی شاگردی نہ کی۔ اپنے زمانے کے مطابق نظیرؔ کی شاعری نرالی تھی۔ اِس سے پیشتر اُردو میں اس قسم کی شاعری موجود نہ تھی۔ اُنہوں نے اپنی شاعری میں عام زبان استعمال کی اور ہندوستان کی خالص چیزوں کو اپنا موضوعِ سخن بنایا چنانچہ یہاں کے میلوں ٹھیلوں۔ یہاں کے تہواروں اور بہاروں پر نظمیں لکھیں۔ اِس جدّت کی وجہ سے اِن کے ہم عصروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ نظیرؔ شاعر نہیں ہے اور اسے ایک معمولی تُک بند شاعر سے زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہئے۔ مگر آج نظیرؔ کو نظمِ لطیف کا بابا آدم تصوّر کیا جاتا ہے۔ نظیرؔ اُن چند شعراء میں سے ایک ہیں جنہوں نے شاعری میں غیر مُلکی جذبات کی بجائے اپنے دیس کے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی۔ نظیرؔ کا مطالعہ کائنات بڑا گہرا تھا۔ اپنے شعروں میں روزمرّہ کے محاورے ہر موقع اور محل کے

مطابق سیدھی سادی زبان میں باندھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ شاہ اودھ نے معقول تنخواہ پر اپنے ہاں دربار میں ملازمت کے لئے بُلا بھیجا تھا۔ مگر۔ اُن کی غیور طبیعت نے آگرہ سے باہر جانا پسند نہ کیا۔ ۱۸۳۰ء کو آگرہ میں اِنتقال کیا اور تاج گنج میں دفن کئے گئے۔ آپ کا مجموعۂ کلام کلیات نظیر کے نام سے مشہور ہے *

(۱)

برسات کی بہاریں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں　　سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھم جھماہٹ قطرات کی بہاریں　　ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اُوپر ہو مست چھا رہے ہیں　　جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں　　گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں　　گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں　　اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے — بچھوا دئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے — بچھوا دئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں کی لہلہاہٹ کچھ ابر کی سیاہی — اور چھا رہی گھٹائیں سُرخ اور سفید کاہی
سب بھیگتے ہیں گھر گھر لے ماہ تا بہ ماہی — یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہے یا رب سامان تیری قدرت — بدلے ہے رنگ کیا کیا ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں پہچان تیری قدرت — تیتر پکارتے ہیں سبحان تیری قدرت

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بولیں بئے بٹیریں، قمری پکارے کُو کُو — پی پی! کرے پپیہا بگلا پکارے تُو تُو
کیا ہُدہُدوں کی حق حق کیا فاختوں کی ہُو ہُو — سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پکھیرو

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو مست ہوں ادھر کے کر شور ناچتے ہیں — پیارے کا نام لیکر کیا زور ناچتے ہیں
بادل ہوا کے گر کر گھنگھور ناچتے ہیں — مینڈک اچھل رہے ہیں اور مور ناچتے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اب برہنوں کے اُوپر ہے سخت بیقراری — ہر بوند مارتی ہے سینے اُوپر کٹاری
بدلی کی دیکھ صورت کہتی ہیں باری باری — ہے ہے! نہ لی پیا نے اب کے بھی سُدھ ہماری

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جب کوئل اپنی اُن کو آواز ہے سُناتی سُنتے ہی غم کے مارے چھاتی اُمڈی آتی
پی پی کی دُھن کو سُنکر بیکل ہیں کہتی جاتی مت بول اے پپیہے پھٹتی ہے میری چھاتی

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اور جن کو مہیّا حُسنوں کی ڈھیریاں ہیں سُرخ اور سنہرے کپڑے عشرت کی گھیریاں ہیں
محبوب دلبروں کی زُلفیں بکھیریاں ہیں جگنو چمک رہے ہیں راتیں اندھیریاں ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارا یا سائبان سُتھرا، یا بانس کا اُسارا
کرتا ہے سیر کوئی، کوٹھے کا لے سہارا مُفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گزارا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

چھت گرنے کا کسی جا غل شور ہو رہا ہے دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
در در حویلی والا ہر آن رو رہا ہے مُفلس سو جھونپڑے میں دلشاد ہو رہا ہے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مدّت سے ہو رہا ہے جن کا مکان پرانا اُٹھ کے ہی ان کو مینہ میں ہے آن چھت پہ جانا
کوئی پکارتا ہے ٹک موری کھول آنا کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہو گیا دِوانا

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کوئی تو جھولنے میں جھولے کی ڈور چھوڑے یا ساتھیوں میں اپنے پاؤں سے پاؤں جوڑے

بادل کھڑے ہیں سر پہ برسیں ہیں تھوڑے تھوڑے
بوندوں سے بھیگتے ہیں لال اور گلابی جوڑے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کتنے تو کیچڑوں کی دلدل میں پھنس رہے ہیں
کپڑے تمام گندی دلدل میں پھنس رہے ہیں
کتنے اُٹھے ہیں مر کر کتنے اُکس رہے ہیں
وہ دُکھ میں پھنس رہے ہیں اور لوگ ہنس رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

(۲)

دیوانہ پن

وہ رشکِ چمن گل جو زیبِ چمن تھا
چمن جنبشِ شاخ سے سینہ زن تھا
گیا میں جو اُس بِن چمن میں تو ہر گل
مجھے ہر گھڑی اخگرِ پیرہن تھا
یہ غنچہ جو بے دردِ گلچیں نے توڑا
خُدا جانے کس کا یہ نقشِ دہن تھا
تنِ مردہ کو کیا تکلّف سے رکھنا
گیا وہ تو جس سے مزیّن یہ تن تھا
نظیرؔ آ گئے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشیّن بدن تھا معطّر کفن تھا
جو قبر کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا
نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

ناسخ

آپ کا نام شیخ امام بخش اور ناسخ تخلص تھا۔ اصلی وطن لاہور تھا۔ مگر شیخ صاحب کی شاعری کا وطن لکھنؤ ہے۔ تعلیم و تربیت فیض آباد میں ہوئی۔ فارسی کی کتابیں حافظ وارث علی لکھنوی سے پڑھی تھیں۔ فارسی زبان کے ماہر تھے۔ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی مگر فن شاعری کی ضروریات سے کما حقہٗ طور پر واقف تھے۔ نظم سخن میں نہایت پابندی کے قائل تھے۔ کسی کی ملازمت اختیار نہ کی۔

اُن کا کلام ظاہری عیوب سے پاک ہے۔ لکھنؤ کے دیگر شعراء کی طرح اُن کے ہاں بھی مبالغہ اور تشبیہات کی خُوب بھرمار ہے۔ مگر اِن چیزوں کو خُوب نبھایا ہے۔ علاوہ ازیں غزلوں میں بلند پروازی نازک خیالی اور شوکت الفاظ بہت ہے۔ چنانچہ ان خصوصیات کو مدنظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اگر قصیدہ کہتے تو خوب ہوتا۔ آپ کے بے شمار شاگرد تھے جو بعد میں بجائے خود اُستاد کہلائے۔ کلیات ناسخ میں غزلوں، رباعیوں اور تاریخوں کے سوا اور کسی قسم کی نظم نہیں ہے۔ شیخ صاحب نے چونسٹھ (۶۴) برس کی عمر پاکر ۱۸۳۸ء میں انتقال کیا۔

غزلیات

(۱)

کافی بس اُس کو نشہ ہے بُوئے شراب کا
ہو بوجھ جس کے ہاتھ میں ساغر حباب کا

ہر ہر قدم پہ پھُوٹتے جاتے ہیں آبلے
نقشِ قدم میں طور ہے چشمِ پُرآب کا

ہر صُبح وہی صُبح ہے ہر شام وہی شام
انساں پہ ہے زور فقط انقلاب کا

آتی ہے خشک و تر سے مجھے بُوئے زُلفِ یار
ہے مُشک کی زمین تو دریا گلاب کا

مُشکل بغیر ساقیِ مہوش ہے دورِ مے
محتاج آفتاب ہوا ماہتاب کا

اپنی غزل پہ آپ ہیں لکھتا ہوں اب غزل
دیکھو جواب ہے سخنِ لاجواب کا

۲

انساں کو انساں سے کینہ نہیں اچھّا
جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھّا

آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے
مرنا ہی یہاں خُوب ہے جینا نہیں اچھا

پہنچا ہی کوئی اوجِ حقیقت کو کب اس سے؟
واعظ ترے منبر کا یہ زینہ نہیں اچھا

ہو سیر جو منظور دلا بحرِ جہاں کی
جز کُشتیٔ درویش سفینہ نہیں اچھا

ہے ہند بھلا کیا ترے رہنے کو کہ ناسخ
مکہ نہیں اچھا کہ مدینہ نہیں اچھّا

(۳)

ہیں وہ شوریدہ سر دیوانہ تھا جو بعد مُردن بھی
چڑھا جاتے ہیں پتھر لوگ آکر میرے مدفن پر

ہمارے نالہائے پُر اثر کی طرز اُڑاتی ہے
گریباں چاک ہو گُل کا نہ کیوں بلبل کے شیون پر

جہاں ہیں تیرہ دِل جو ہیں وہی بے رنج رہتے ہیں
کہ نازل ہوتی ہے آفت ہوا کی شمعِ روشن پر

ہمارے زخم کے نظّارے کی کب تاب ہے اس کو
تو اے جرّاح! پہلے باندھ پٹی چشمِ سوزن پر

کسی کا درد ہوتا ہے کسی کو کب زمانے میں؟
کہ جام و گُل ہیں خنداں شیشہ و بُلبُل کے شیون پر

اگر ہوتا ہے اک دانہ بھی اس میں میری قسمت کا
فلک بجلی گرا دیتا ہے ناسخ میرے خرمن پر

(۴)

مردِ وارستہ کہیں قیدِ مکاں کرتا نہیں
طائرِ نکہت خیالِ آشیاں کرتا نہیں

روز اک شام و سحر کرتا ہے پیدا بہرِ خلق
صُبح میری شامِ غم کو آسماں کرتا نہیں

ہے ہر اک آفت سے امین مسکنِ اہلِ فنا
باغِ جنّت کو خُدا ہر گز خزاں کرتا نہیں

رحم کر عشّاق پر گر چاہئے عُمرِ دراز
پیرِ گردوں طفلِ ظالم کو جواں کرتا نہیں
عیب اپنے آپ کر دیتے ہیں ہم بد مست فاش
شیشۂ مے جس طرح مے کو نہاں کرتا نہیں
جام مے ہیں دیکھتا ہوں میں جہاں کو مثلِ جم
گو سکندر کی طرح سیرِ جہاں کرتا نہیں!

آتش

آپ کا نام خواجہ حیدر بخش اور آتش تخلّص تھا۔ ۱۷۶۷ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اصلی وطن دِلّی تھا۔ مگر لکھنؤ میں سکونت اِختیار کی۔ زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ مگر محنت اور مشق سے زمانے میں مسلم الثبوت کہلائے۔ آپ کے شعر و سخن کا وہ ڈنکا بجا کہ بے شمار لوگ شرفِ تلمّذ حاصل کرنے لگے۔ اور بعد میں خود اُستاد کہلائے۔ آتش شیخ ناسخ کے ہم عصر تھے اور اُن کے اکثر معرکے رہتے۔ ۱۸۴۷ء میں اِنتقال کیا۔ کسی نے تاریخ لکھی ہے :-

"خواجہ حیدر علی اے وا مرد ند"

آپ کا کلام سلاست زبان اور صفائی کلام کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہے۔ اور محاورہ اُردو کا دستور العمل اور شرفائے لکھنؤ

کی بول چال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ کلام بلند خیالی سے خالی نہیں۔ طرزِ بیان صاف اور سادہ ہے۔ بات کو سیدھے سادے طریقے پر کہتے تھے۔ اور کلام میں عشق حقیقی اور مجازی دونوں کے جلوے ملتے ہیں۔ مضامین عاشقانہ و رندانہ میں ایک خاص انداز رکھتے ہیں۔ تصنّع اور تکلّف جو لکھنؤ والوں کا ایک خاصہ بن چکا تھا۔ ان کے ہاں بھی موجود ہے۔ مگر اس قدر بھدّا اور بھونڈا نہیں ہے۔

غزلیات

(۱)

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟ — کہتی ہے خلق خُدا تجھے غائبانہ کیا؟
زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف — قاروں نے راستے میں لُٹایا خزانہ کیا؟
اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عُمر — مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا؟
چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر — دِل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا؟
صیّاد اسیرِ دام رگِ گُل ہے عندلیب — دِکھلا رہا ہے چھُپ کے اُسے دام و دانہ کیا؟
طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ مُلک و مال — ہم سے خِلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟
آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو؟ — دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا؟

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تُو نے کہی عاشقانہ کیا؟

(۲)

ہاتھ قاتل کا مرے خنجر تک آ کر رہ گیا
کہنیوں تک آستینوں کو چڑھا کر رہ گیا

باغ میں بُلبلوں کو جو اُڑا کر رہ گیا
خندہ زن گُل ہو کے غنچہ مُسکرا کر رہ گیا

ہو چکی تھی میرے نالوں سے قیامت آشکار
خواب سے سر فتنۂ محشر اُٹھا کر رہ گیا

سوزشِ دل سے جلے لیکن زباں سے اُف نہ کی
صورتِ بُت خانہ دِل ہونٹوں پہ آ کر رہ گیا

جب کسی لیلیٰ شمائل کا سُنا کانوں سے ذکر
بید مجنوں کی طرح میں تھر تھرا کر رہ گیا

شمع ساں اظہار کا یارا نہ آتش کو ہوا
سرگزشت اپنی زباں تک اپنی لا کر رہ گیا

(۳)

حسرتِ شادی نہیں جانِ غم آلود کو
لالہ سمجھتا ہے دل داغِ نمک سود کو

داغِ غمِ عشق کو دِل میں جگہ دیجیئے
ڈھونڈیئے لیکر چراغ شاہدِ مقصود کو

پردۂ غفلت اُٹھا پیشِ نظر یار ہے
دیر و حرم میں نہ جا ڈھونڈھیئے موجود کو

سجدہ کے انکار سے فوق نہ ہو جائیگا
خاکیٔ مقبول پہ ناریٔ مردود کو!

سبحۂ بے معرفت حلقہ میں اپنے نہیں
رہ نہیں اس بزم میں مجرمِ بے عُود کو

صاحب اقبال کو خوب ہے پہچانتا — آنکھ خدا نے ہے دی کوکبِ مسعود کو

راہ کی آفات کا کیجیو آتش بیان

سامنے آنے تو دے منزلِ مقصود کو

(۴)

بازارِ دہر میں تری منزل کہاں نہ تھی — یوسف نہ جسمیں ہو کوئی ایسی دکاں نہ تھی

منزل ہی دور ہے جو پہنچی نہیں ہنوز — دم لینے والی راہ میں عمرِ رواں نہ تھی

دکھلائے سیر آنکھوں کو بامِ مراد کی — ایسی کوئی کمند کوئی نردباں نہ تھی

رہ جانا پیچھے جسم کا جاں سے عجب نہیں — کس کارواں کی گردِ پسِ کارواں نہ تھی

نافہمی کی دلیل ہے یہ سجدہ سے اِبا — ابلیس کو حقیقتِ آدم عیاں نہ تھی

افسوس کیا جوانیٔ رفتہ کا کیجئے — وہ کونسی بہار تھی جس کو خزاں نہ تھی

نالوں سے ایک دن نہ کئے گرم گوشِ یار

آتش مگر تمہارے دہن میں زباں نہ تھی

مومنؔ

حکیم مومن خان نام اور مومنؔ تخلّص کرتے تھے۔ ۱۸۰۰ء حکیم غلام نبی خان دہلوی کے ہاں تولّد ہوئے۔ اِن کے بُزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ جنہیں شاہِ عالم کے عہد میں پنجاب کے ایک پرگنہ نارنول میں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ مومنؔ نے عربی فارسی میں ہی کمال حاصل نہ کیا تھا بلکہ ان کے علاوہ کئی دیگر مختلف علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ علم نجوم میں دُور دُور تک اُن کا کوئی مدمقابل نہ تھا۔ ریاضی، رمل اور اپنے آبائی پیشے فنِّ طب وغیرہ میں مہارت تھی۔ شاعری میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ مگر بعد میں انہیں اپنا کلام دکھانا بند کر دیا تھا۔ ایسی مشق سخت بڑھائی کہ خود اُستاد ہو گئے

بڑے نازک طبع، عاشق مزاج اور عالی خیال تھے، اور یہی چیزیں خاص طور سے آپ کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ غزل کے علاوہ قصیدے، واسوخت اور مثنویاں بھی کہی ہیں۔ مگر سبھی میں رنگینئی عشق، طبیعت کی جدّت پسندی، بیباکی اور حسرت نصیبی پائی جاتی ہے۔ غرضیکہ ان کے کلام کا بھی ایک نرالا رنگ ہے۔ جو مرزا غالبؔ کے کلام کی طرح پُرانا نہیں ہوا۔ جب پڑھیں نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔

حکیم مومن خان مومنؔ کوٹھے پر سے گر کر ۳۵ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ علم نجوم کی مدد سے موت سے پیشتر کہہ رکھا تھا کہ پانچ مہینے یا پانچ برس بعد مر جاؤں گا۔ آخر پانچ ماہ بعد مر گئے

"دست و بازو بشکست"

غزلیات

(۱)

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
بیوفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
اُس نے کیا جانے کیا کیا لے کر — دل کسی کام کا نہیں ہوتا
کس کو ہے ذوقِ تلخ کامی لیک — جنگ بن کچھ اثر نہیں ہوتا
تُم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا)
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سُنے عرضِ مضطرب مومنؔ
صنم آخر خُدا نہیں ہوتا

(۲)

اے آرزوئے قتل ذرا دل کو تھامنا — مشکل پڑا مرے قاتل کو تھامنا

تاثیرِ بے قراریِ ناکام آفریں | ہے کام اُن سے شوخ شمائل کو تھامنا
دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے | اے چرخ اپنے تو مہِ کامل کو تھامنا
ہو صرصرِ فغاں سے نہ کیونکر وہ مضطرب | مُشکل ہوا ہے پردۂ محمل کو تھامنا
اے ہمدم آہ تلخیِ ہجراں سے دم نہیں | گرتا ہے دیکھ جامِ ہلاہل کو تھامنا
باقی ہے شوقِ چاکِ گریباں ابھی مجھے | بس اے رفوگر اپنی انامل کو تھامنا

مت مانگیو امان بتوں سے کہ ہے حرام
مومن زبانِ بیہدہ سائل کو تھامنا

(۳)

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں | کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں
کیسی حیرت ہے اے سبک روحی | دیکھے ہی دیدۂ حباب ہمیں
وہ جفاکش ہیں اے فلک کہ کیا | اُس ستمگر نے انتخاب ہمیں
کس کی زُلفوں کی بُو نسیم میں تھی | ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں
اب کوئی کیا کرے علاج افسوس | موت نے بھی دیا جواب ہمیں

اے تپِ ہجر دیکھ مومن ہیں
ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

(۴)

ہے دِل میں غُبار اُسکے گھر اپنا نہ کرینگے | ہم خاک میں ملنے کی تمنّا نہ کریں گے

کیونکر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کرینگے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں
اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کرینگے

کیا نامہ میں لکھوں دلِ وابستہ کا احوال
معلوم ہے پہلے ہی کہ وہ وا نہ کرینگے

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ
اچھا بھی کرینگے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

ناصح کفِ افسوس نہ مل چل تجھے کیا کام
پامال کرینگے وہ مجھے یا نہ کریں گے

گر ذکرِ وفا سے بھی غصہ ہے تو اب سے
گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

مومن وہ غزل کہتے ہیں اب جس سے یہ مضمون
کھل جائے کہ ترکِ درِ بت خانہ کریں گے

(۵)

مشورہ کیا کیجے چرخِ پیر سے
دن نہیں پھرتے کسی تدبیر سے

کس طرح مایوس ہوں تاثیر سے
دم رکے ہے نالۂ شبگیر سے

میری وحشت کے لئے صحرائے قیس
تنگ تر ہے خانۂ زنجیر سے

انگلیوں میں خامہ جم کر رہ گیا
نامہ ہائے شوق کی تحریر سے

اے صنم مومن ہوں آخر کس طرح
مجھ کو تسکیں ہو تری تصویر سے

ذوق

شیخ محمّد ابراہیم نام اور ذوقؔ تخلّص تھا۔ سنہ ۱۷۹۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد شیخ محمّد رمضان ایک غریب سپاہی تھے ذوقؔ کو شروع ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ شروع میں حافظ غلام رسول شوق کو اپنی غزلیں دکھاتے تھے۔ بعد میں شاہ نصیرؔ دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ کچھ دنوں بعد شاہ نصیرؔ سے اَن بن ہو گئی، اور اُنہوں نے کسی کو بھی کلام دکھانا بند کر دیا۔ اپنی طبیعت پر زور دے کر شاعری کرنے لگے، اور اپنے ایک دوست شاعر میر کاظم حُسین بیقرار کے ذریعے قلعہ میں رسائی حاصل کی۔ بعد میں ولیعہد بہادر شاہ ظفرؔ کے اُستاد مُقرر ہوئے۔ اُنیس سال کی عُمر میں ذوقؔ کو اکبر شاہ ثانی نے خاقانئ ہند کا خطاب عطا کیا، اور بہادر شاہ ظفرؔ کی تخت نشینی کے بعد مَلِک الشعراء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ ظفرؔ کے علاوہ محمد حُسین آزادؔ بھی ذوقؔ کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ سنہ ۱۸۵۵ء میں انتقال کیا۔

ذوقؔ کا کلام سادہ اور عام فہم ہے۔ خیالات بہت بلند ہیں۔ مگر وہ جدّت پسندی جو غالبؔ اور مومنؔ کے ہاں مِلتی ہے۔

ان کے یہاں کم ہے۔ ان میں یہ کمال تھا کہ ہر قسم کا خیال جس رنگ میں چاہتے کہہ سکتے تھے۔ محاورات اور ضرب الامثال کو اشعار میں باندھنے میں کمال رکھتے تھے۔ ان کے ہاں اخلاقی شاعری کے اعلےٰ نمونے ملتے ہیں۔ ذوقؔ غزل کے علاوہ قصیدے کے میدان کے بھی شہسوار تھے۔ سوداؔ کے بعد اگر کسی صاحبِ کمال قصیدہ گو شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ تھے۔

(۱)

لکھئے اُسے خط میں ستم اُٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلےٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

جوں دانۂ روئیدہ تہِ خاک ہمارا
سر زیرِ گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گرانبار ہے جو زادِ سفر بھی
اے راہ روِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

دُنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوقؔ
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

(۲)

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اُسکو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امّارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کی
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دے کر
جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگِ لعل غرقِ خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر دل دونوں پہلو میں ہیں زخمی اس نے کیا جانے
اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگین خسرو پر بھی ضرب کوہکن پہنچا
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

(۳)

وہ کون ہے جو مجھ پہ تأسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

کیا قہر ہے وقفہ ہے ابھی آنے میں اُن کے
اور دم مرا جانے میں توقف نہیں کرتا

تا صاف کرے دل نہ مئے صاف سے صوفی
کچھ سود و صفا علمِ تصوّف نہیں کرتا

دلِ فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے
دُنیا کے زر و مال پہ میں تُف نہیں کرتا

پڑھتا نہیں خطِ غیر مرا واں کسی عنواں
جب تک کہ عبارت میں تصرّف نہیں کرتا

کچھ اور گماں گزرے نہ دلمیں تیرے کافر
یاد ہیں لئے ہیں سورۂ یوسف نہیں کرتا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

(۴)

ابر کیا؟ آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
یہ برق کیا؟ تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

پوچھے ملا سے جسے کرنا ہو سجدہ سہو کا
سیکھے گر اپنا بھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

دیکھ کر قاتل کو بھر لائے خراش دل میں خوں
سچ تو یوں ہے مسکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جب کہا "مرتا ہوں" وہ بولے مرا سر کاٹ کر
جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں بٹے ابرو یہاں پھیری گلے پہ ہم نے تیغ
بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

سنکر آمد انکی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہم نے پہلے ہی کہا تھا "تو کریگا ہم کو قتل"
تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو سکھایا اپنی قسمت نے وگرنہ اُس کو غیر
کیا سکھائیگا سکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوق ہیں جوں مردمک ہم رو سیاہ؟
لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

(۵)

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
اُنکا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

چاہیں گر چارہ جراحت کا محبت والے
بیچیں الماس و نمک سنگ جراحت والے

گئے جنت میں اگر سوزِ محبت والے
تو یہ جانو رہے دوزخ ہی میں جنت والے

ساقیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
صُبحِ محشر کو بھی اُٹھیں نہ ترے متوالے

رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

کس مرض کی ہیں دوا یہ لبِ جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزادِ محبت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دُنیا میں فراغت والے

ہائے رے حسرتِ دیدار مری "ہائے" کو بھی
لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے کتابت والے

نہیں جز شمع مجاور مری بالینِ مزار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
دیکھو تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

کیا تماشا ہے کہ مثلِ مہِ نو اپنا فروغ
جانتے اپنی حقارت کو ہیں شہرت والے

دل سے کچھ کہتا ہوں میں مجھ سے ہی دل کچھ کہتا
دونوں اک حال میں ہیں رنج و مصیبت والے

چھوڑ دیتے ہیں قلم جوں قلمِ آتشبار
میری شرحِ تپشِ دل کی کتابت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دِل بیمار کے ہیں دو ہی عیادت والے

تو مرے حال سے غافل ہی برائے غفلت کیش
تیرے اندازِ تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہے گُل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

نسیمؔ

نام دیا شنکر اور نسیمؔ تخلّص کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۱۱ء میں گنگا پرشاد کشمیری پنڈت کے گھر پیدا ہوئے۔ فارسی میں کافی اِستعداد رکھتے تھے۔ شعر و سخن کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ چنانچہ ابھی سترہ برس ہی کی عُمر تھی کہ خواجہ آتشؔ مرحوم کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے تھے۔ اور اُن سے اصلاحِ سخن لیتے رہے۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں اِنتقال کیا۔

نسیمؔ نے غزلوں کا ایک دیوان بھی بطور یادگار چھوڑا ہے مگر وہ اُردو میں اپنی غزلوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مثنوی گلزارِ نسیم کی وجہ سے خاص شہرت کے مالک ہیں۔ اس مثنوی کو اُنہوں نے اپنی کم سنی میں ہی نہایت محنت اور جانفشانی سے تیار کیا تھا۔ اگرچہ اس مثنوی کا پلاٹ ہماری کے ایک پُرانے قصّے سے لیا گیا ہے۔ مگر نسیمؔ نے ادائے مطلب میں ایک دلفریب حُسن پیدا کیا ہے۔ ایک طولانی قصّہ کو مختصر الفاظ میں نظم کر کے قصّہ اور نظم کی شان کو بڑھا دیا ہے۔

(۱۱)

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

گل چیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صُبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغِ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام
جاگی مُرغ سحر کے غُل سے — اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے
مُنہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گُل ہوا ہُوا ہے — کچھ اور ہی گُل کھلا ہُوا ہے
گھبرائی کہ ہیں اِکدھر گیا گُل؟ — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل؟
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟ — ہے ہے! مجھے خار دے گیا کون؟
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے
نرگس! تو دکھا، کدھر گیا گُل — سوسن! تو بتا، کدھر گیا گُل!
سنبل، مرا تازیانہ لانا! — شمشاد، انہیں سُولی پر چڑھانا
تھرائیں خواصیں صورتِ بید — ایک ایک سے پُوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں، — سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں کیا ہوا خُدایا!
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون؟ — بے گانہ تھا سبزہ کے سوا کون؟

شبنم کے سوا چرانے والا
اُوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گُل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گُل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاولی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پُتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اس کا صبا! نہ لیتی تھی میں
اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا،
غنچہ کے بھی مُنہ سے کچھ نہ پھُوٹا

او خار! پڑا نہ تیرا چینگل،
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او بادِ صبا! ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا، پتا نہ بتلا

بُلبُل تو چہک اگر خبر ہے
گُل تو ہی مہک، بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمین یہ دیکھ کہرام
تھی سبزے سے راست مو براندام

انگلی لبِ جو پہ رکھ کے شمشاد
تھا دم بخود اس کی سُن کے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا،

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے
گُل برگ سے کف لگی وہ ملنے

بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی
دست آویز اس کے ہاتھ آئی

خاتم تھی نام کی نشانی
اِنسان کی دست برد جانی

ہاتھوں کو ملا، کہا کہ ہیہات
خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات

جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا
وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا

عُریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے — کھال اس کی جو کھینچئے سزا ہے
یہ کہہ کے جنوں میں ہو غضبناک — خوں روئی لباس کو کیا چاک
گُل کا سا لہو بھرا گریباں — سبزے کا سا تار تار داماں
دِکھلا کے کہا سمن پری کو — اب چین کہاں بکاولی کو
تھی بس کہ غبار سے بھری وہ — آندھی سی اُٹھی، ہوا ہوئی وہ
کہتی تھی پری کہ اُڑ کے جاتی — گُل چیں کا کہیں پتہ لگاتی
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ — ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختے میں مثل باد جاتی — اس رنگ کے گُل کی بُو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتا کہیں حُکم بن ہلا ہے

غالب

نام اسداللہ خان عُرف مرزا نوشہ، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ ۲۷۔ستمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے شروع میں اسد تخلّص کیا کرتے تھے۔ مگر بعد میں اسے ترک کرکے غالب اختیار کر لیا۔

مرزا غالب کے بزرگ شاہ عالم کے زمانے میں دہلی میں آئے تھے۔ ان کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مرزا ابھی پانچ ہی برس کے تھے کہ والد عبداللہ بیگ کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس کے بعد مرزا کو ان کے چچا نصر اللہ بیگ نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ نصر اللہ بیگ اُن دِنوں اکبر آباد کے صوبیدار تھے۔ قسمت نے یہاں بھی یاوری نہ کی۔ چچا بھی چار برس کے بعد اِنتقال فرما گئے۔

مرزا کی شادی نواب الٰہی بخش خان دہلوی کی لڑکی سے ہوئی اور اِس بنا پر مرزا نے آگرہ کو چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ذوق کی وفات کے بعد شہنشاہ ظفر کے کلام کی تصحیح کیا کرتے تھے ویسے تو مرزا نے اپنے بزرگوں سے خاصی جائداد ورثہ میں پائی تھی۔ مگر انہیں تو ملک سخن پر قناعت کرنا تھی۔ آخری ایّام میں دِلّی کے اُجڑ جانے پر مرزا کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اقلیم سخن کے اس شہنشاہ نے سنہ ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

مرزا غالب فارسی نظم و نثر کے مُسلّم الثبوت اُستاد تھے شروع شروع میں اُردو کلام میں فارسی کی آمیخت زیادہ ہوتی تھی۔ مگر بعد میں شاگردوں اور عزیزوں کے اصرار پر یہ رنگ بدل دیا تھا۔ اگرچہ مرزا نے اُردو میں بہت زیادہ نہیں کہا ہے۔ مگر جس قدر کہا ہے عدیم النظیر ہے

جوں جوں زمانہ گزرتا جارہا ہے۔ مرزا کے کلام کو زیادہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے۔ کلام میں جدّت پسندی جوہر خاص ہے۔ اس کے علاوہ ان کی معنی آفرینی، طنز اور شوخی اپنی مثال آپ ہیں مرزا غالبؔ کے خطوط جو انہوں نے اپنے عزیزوں اور شاگردوں کو لکھے، اُردو میں ماڈرن نثر کے سنگ بُنیاد تصوّر ہوتے ہیں۔

مرزا غالبؔ کی مشہور تصانیف کلیات نظم و نثر فارسی، دیوانِ غالبؔ، عودِ ہندی، اُردوئے معلےٰ، پنج آہنگ۔ مہر نیم روز اور دستنبو وغیرہ ہیں۔

(۱)

بسکہ دشوار ہی ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں اِنساں ہونا

گریہ چاہے ہی خرابی مری کاشانے کی
درودیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہردم مجھ سے
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہی
جوہر آئینہ بھی چاہے ہی مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہ اہل تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہی شمشیر کا عُریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنّائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دِل زخمِ تمنّا کھانا
لذّتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۲)

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا؟ — زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا؟
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک — ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا؟
حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں — عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی — یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں — ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

(۳)

ہے بس کہ ہر اک اُنکے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبّت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دلِ اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھینگے — لے آئینگے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہی خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور
لوگوں کو ہی خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رکتی ہی مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہی انداز بیاں اور

(۴)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں شب کو اُنکے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے ہے زُلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہی شامِ فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
اِن پری زادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام قُدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
نیند اُسکی ہی دماغ اُس کا ہی راتیں اُسکی ہیں تیری زُلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں
میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا بلبلیں سُنکر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دُعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

جانفزا ہے بادہ جسکے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مُشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

(۷)

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اُس کی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عُمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھُل جائے ظالم تری قامت کی درازی کا

اگر اس طرّہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے،

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبّت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(۶)

کسی کو دے کے دِل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دِل ہی سینے میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پُوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اِس محبت کو،
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

(۷)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
ہیں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ ای خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلف عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشم سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہی ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہی اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — ہیں نہیں جانتا دعا کیا ہے

ہیں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

(۸)

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اک خبر ہی زبانی طیور کی
گو واں نہیں پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
کیا فرض ہی کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ کہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام ہیں لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی
غالب گر اس سفر ہیں مجھے ساتھ لے چلیں — حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

دبیر

نام مرزا سلامت علی اور دبیرؔ تخلّص تھا۔ ۱۸۰۳ء میں مرزا غلام حسین کے ہاں تولّد ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد کا وطن بھی دہلی تھا، مگر ان کے شعر و سخن کا آفتاب لکھنؤ میں چمکا۔ شاعری میں میر مظفّر حسین ضمیرؔ سے شرف تلمّذ حاصل کیا۔ لڑکپن میں مرثیہ خوانی کا بڑا شوق تھا چناں چہ اسی شوق نے مرزا دبیر کو مرثیے کہنے پر راغب کیا، مرزا دبیرؔ نے ۱۸۷۴ء میں انتقال کیا۔

مرزا دبیرؔ نے بڑی گداز طبیعت پائی تھی۔ اس کے علاوہ اُنکی سلاست روی، پرہیزگاری اور فیّاضی وغیرہ نے مرثیہ گوئی کا مواد مہیّا کیا۔ ان کے مرثیوں میں جابجا الم ناک اور دل گداز اِشارے ہیں جو مرثیہ کے جوہر خاص تصوّر کئے جاتے ہیں۔ دبیرؔ کے کلام میں شوکت الفاظ بلاغت اور معنیٰ آفرینی کا عنصر نمایاں ہے۔ تصنّع اور آورد عام ہے۔ مرزا دبیر فطرت نگاری کے خُوب ماہر تھے۔ ان کے زمانے میں دو گروہ بن گئے تھے۔ جو انیسیے اور دبیریے کہلاتے تھے۔ انیسؔ کے قائل کلام میں بے ساختہ پن اور سوز و گداز کے شیدائی تھے اور دبیرؔ کے ماننے والے شوکت الفاظ، مبالغہ اور صنائع بدائع کو

جانِ سخن سمجھتے تھے۔ کچھ بھی کیوں نہ ہو، مرثیہ نگاری میں انیسؔ اور دبیرؔ آفتاب و ماہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے انداز اگرچہ جُدا جُدا ہیں۔ مگر اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں ٭

(۱)

رجز

ہم دَل میں جب ڈرائیں گے فوجِ شریر کے
جوہر کھلیں گے طاقتِ برناؤ پیر کے
ٹکڑے کریں گے خنجر و شمشیر و تیر کے
وارث ہیں ذوالفقارِ جناب امیر کے
اِک اِک کی موت آج حسامِ دو سر سے ہے
قبضہ قضا کی تیغ پہ حُکمِ قادر سے ہے

(۲)

تلوار

جب مورچے پہ لیلیٰ تیغ دو سر گئی
چنگے بھلوں کو سائے سے دیوانہ کر گئی
ہر صف میں خاک اُڑا کے اِدھر سے اُدھر گئی
پھر خود نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر پڑی
سر پر جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی

تجویز جو لعینوں نے کی وہ مُنھ پر پڑی
افتادان سے پُوچھئے یہ جن کے سر پڑی

اُٹھی، گری، بلند ہوئی پست ہو گئی
پی پی کے مے کشوں کا لہو مست ہو گئی

(۲۳)

رُباعیات

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گُل کو رنگ و بُو دیتا ہے

بیکار تشخص ہے تصنع بے سود
عزّت وہی عزّت ہے جو تو دیتا ہے

پیش اُمرا طالب زر جھکتے ہیں
سجدے کی طرح مجرے کو سر جھکتے ہیں

سنجیدہ ہیں یہ لوگ ترازو کی طرح
ہے مال سوا جدھر اُدھر جھکتے ہیں

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا
قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا

تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل
پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

پروانے کو دُھن شمع کو لونتری ہے
عالم میں ہر اک کو ٹنگ و دُو تری ہے
مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب
جس نُور کو دیکھتا ہوں ضَو تری ہے

انیسؔ

نام میر ببر علی اور انیسؔ تخلّص تھا۔ ۱۸۰۲ء میں میر مُستحسن خلیق کے گھر فیض آباد میں تولّد ہوئے۔ میر حسن مُصنّف سحر البیان کے پوتے تھے۔ اگرچہ بزرگوں کا اصلی وطن دہلی تھا۔ مگر انیسؔ نے لکھنؤ ہی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ذوقِ شعر و سخن ورثہ میں پایا تھا۔ چنانچہ خود فرمایا ہے ؎

عُمر گذری ہے اس دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبّیر کی مدّاحی میں

شاعری میں اپنے والد ہی کی شاگردی اختیار کی۔ میر انیسؔ نے ۷۴ برس کی عُمر میں لکھنؤ میں اِنتقال کیا۔

اُردو شعر و ادب میں رزمیہ شاعری کی ایک بڑی کمی تھی۔ جسے میر انیسؔ نے نہ صرف دُور کیا۔ بلکہ اس میں شعر و سخن کے وہ وہ دریا بہائے کہ آنے والی نسلوں کے لئے مزید اضافے کی گنجائش

نہ چھوڑی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گوئی اختیار کرتا ہے مگر انیس نے اس صنف میں وہ چار چاند لگائے، اور ایسی جہریں ثبت کیں کہ نظیر قائم نہ ہو سکی۔ ان کے کلام میں انسانی جذبات کی تصویر کشی اپنی مثال آپ ہے۔ ایک مضمون کو سو سو طرح سے پیش کرنا میر انیس کا ہی خاصہ تھا۔ نفسیاتی تحلیل، سیرت نگاری اور واقعہ نگاری پر انہیں قدرت حاصل تھی۔

مراثیٔ انیس کا مجموعہ چار جلدوں میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ بعد میں مولانا طباطبائی نے تصحیح اور ترتیب کے ساتھ پانچ جلدوں میں چھپوا کر پیش کیا ہے۔

(۱)

رجز

تنہائی میں ایک ایک کو حضرت نے پکارا
کون آئے کہ فردوس میں تھا قافلہ سارا

گھوڑے پہ چڑھا خود اسد اللہ کا پیارا
اونچا ہوا افلاک امامت کا ستارا

شوخی سے فرس پاؤں نہ رکھتا تھا زمیں پر
غل تھا کہ چلا قطب زماں عرش بریں پر

اعدا کی زبانوں پہ یہ حیرت کی تھی تقریر
حضرت یہ رجز پڑھتے تھے تولے ہوئی شمشیر

دیکھو نہ مٹاؤ مجھے اے فرقۂ بے پیر　　ہیں یوسفِ کنعانِ رسالت کی ہوں تصویر
واللہ تعالیٰ نہیں یہ کلمۂ حق ہے
عالم کے مرقع میں حسین ایک ورق ہے

واللہ جہاں میں مرا ہمسر نہیں کوئی　　محتاج ہوں پر مجھ سا تونگر نہیں کوئی
ہاں میرے سوا شافعِ محشر نہیں کوئی　　یوں سب ہیں مگر سبطِ پیغمبر نہیں کوئی
باطل ہے اگر دعوئ اعجاز کرے گا
کس بات پہ دنیا میں کوئی ناز کرے گا

ہم وہ ہیں کہ اللہ نے کوثر ہمیں بخشا　　سرداریٔ فردوس کا افسر ہمیں بخشا
اقبالِ علی خلقِ پیمبر ہمیں بخشا　　قدرت ہمیں دی زور ہمیں زر ہمیں بخشا
ہم نور ہیں گھر طورِ تجلّا ہے ہمارا
تختِ بنِ داؤد مصلّا ہے ہمارا

یہ فرق پہ عمامۂ سردارِ زمن ہے　　یہ تیغِ علی ہے یہ کمربندِ حسن ہے
یہ جوشنِ داؤد نبی جو حافظِ تن ہے　　یہ پیرہنِ یوسفِ کنعانِ محن ہے
دکھلائیں سنار دستِ رسولِ عربی کی
یہ مہرِ سلیماں ہے یہ خاتم ہے نبی کی

دیکھو تو یہ ہے کون سے جرار کی تلوار　　کس شیر کے قبضہ میں ہے کرار کی تلوار
دریا نے بھی دیکھی نہیں اس دھار کی تلوار　　بجلی کی تو یہ بجلی ہے تلوار کی تلوار

قہر و غضب اللہ کا ہے کاٹ نہیں ہے
کہتے ہیں اِسے موت کا گھر گھاٹ نہیں ہے

دم لے کہیں رُک کے وہ روانی نہیں اسمیں
چلنے ہیں سکتے ہی گرانی نہیں اسمیں
جُز حرف تہی اور نشانی نہیں اسمیں
جل جاؤ گے سب آگ ہی پانی نہیں اسمیں
چھوڑے گی نہ زندہ اسے جو دُشمن دیں ہے
تابیں نہیں غصے سے اجل چیں بجبیں ہے

اعدا کیا قہرِ خدا سے نہیں ڈرتے
ناری تو ہیں دوزخ کی جفا سے نہیں ڈرتے
فریادِ رسولِ دوسرا سے نہیں ڈرتے
خاتونِ قیامت کی بکا سے نہیں ڈرتے
یہ لوگ جدھر دولتِ دنیا ہے ادھر ہیں
اللہ سے کچھ کام نہیں بندۂ زر ہیں

(۲)

تلوار کی تعریف

جلوہ کیا بدلی سے نکل کر مہِ نو نے
دکھلائے ہوا میں دو ہر اک شمع کی لو نے
تڑپا دیا بجلی کو فرس کی تگ و دو نے
تاکا سپرِ مہر کو شمشیر کی ضو نے
اعدا تو چھپانے لگے ڈھالوں میں سروں کو
جبریل نے اونچا کیا گھبرا کے پروں کو

بالا سے جو آئی وہ بلا جانب بستی — بس نیست ہوئی دم میں ستمگار کی ہستی
چلنے لگی یک دست جو شمشیر دو دستی — معلوم ہوا اُلٹ گئی سب کفر کی بستی
زور اُن کے ہر اک ضرب میں اللہ نے توڑے
ٹوٹیں جو صفیں تب اسد اللہ نے توڑے

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی — ناری اُدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی — پی پی کے لہو لعل اُگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر نہ کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

موجود بھی ہر غول میں اور سب سے جدا بھی — دم خم بھی لگاوٹ بھی صفائی بھی ادا بھی
اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی پانی بھی ہوا بھی — امرت بھی ہلاہل بھی مسیحا بھی قضا بھی
کیا صاحب جوہر تھی عجب ظرف تھا اس کا
موقعہ تھا جہاں جس کا وہیں صرف تھا اس کا

(۳)

صُبح

چلنا وہ بادِ صُبح کے جھونکوں کا دمبدم — مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا
وہ صُبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارِنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے
ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگِ گُل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

(۴۰)

شیر اُٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے — آہو نہ مُنہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر
گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں — انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں — تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں

پانی تھا آگ گرمئ روزِ حساب تھی
ماہی جو موجِ سیخ تک آئی کباب تھی

(۵)

رُباعیات

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفان ہے
مانندِ حباب ہستئ اِنسان ہے
لنگر ہے جو دل تو ہر نفس بادِ مُراد
سینہ کشتی ہے ناخُدا ایمان ہے

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے
جاگو جاگو کہ خوف اسی راہ میں ہے
اُٹھو اُٹھو یہ خوابِ غفلت کب تک
دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

امیر مینائی

امیر احمد نام اور امیر تخلّص تھا۔ شاہ نصیر الدّین حیدر کے

عہد میں سنہ ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ شعر و سخن کا ذوق شروع سے تھا اور اصلاح سخن کے لئے امیر لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جب لکھنؤ کا دربار اُجڑ گیا تو رام پور کا رُخ کیا جہاں بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جانے لگے۔ نواب کلب علی خان والئی رام پور کی وفات کے بعد حیدرآباد چلے گئے تھے، جہاں سنہ ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔

امیر مینائی اپنے زمانے کے مسلّم الثبوت اُستاد تھے اور متاخرین میں ممتاز درجہ کے شاعر تھے۔ ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے تھے زبان و بیان میں پوری مہارت و قدرت تھی۔ وارداتِ عشق و محبت کو بہت خوب نظم کرتے تھے۔ ان کا کلام عام طور پر صاف اور سادہ ہے، اور اُن کے اشعار میں ہرگز اُلجھاؤ نہیں پایا جاتا۔

(۱)

کچھ ٹھکانا ہے ناتوانی کا — نہ اُٹھا بوجھ زندگانی کا
مرگ جس کو جہاں میں کہتے ہیں — نام ہے میری زندگانی کا!
مثل شبنم ہماری قسمت ہے — ایک دانہ ہے وہ بھی پانی کا
بہر نام سکندر آئینہ — چشمہ ہے آبِ زندگانی کا
نہ اُٹھے مفلسی میں دستِ سوال — ہے یہ احسان ناتوانی کا

منتظر حشر ہیں ہے، دامنِ تر مہر محشر کی مہربانی کا
زلیست کا اعتبار کیا ہے امیرؔ
آدمی بلبلہ ہے پانی کا!

(۲)

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا کرتا نہ ہیں گنہ تو گناہِ عظیم تھا
باتیں بھی کیں خدا نے دکھایا جمال بھی اللہ کیا نصیب جناب حکیم تھا
دنیا کا حال اہلِ عدم ہی یہ مختصر اک دو قدم کا کوچۂ اُمید و بیم تھا
کرتا ہیں درد مند طبیبوں سے کیا رجوع جس نے دیا تھا درد بڑا وہ حکیم تھا
جس دن تھا ہیں چمن ہیں ہوا خواہ گل امیر
نام صبا کہیں نہ نشانِ نسیم تھا

(۳)

گلشن ہیں سرو فوج ہیں تیل نشاں رہے عالم ہیں سر بلند رہی ہم جہاں رہے
نیرنگ ان کی شانِ تجلّی کے دیکھئے اتنے ہوئے عیاں کہ نظر سے نہاں رہے
گلشن ہیں مجھ سی ہی یہ تقاضا تھا اضطراب کھٹکا ہو جس شجر ہیں وہیں آشیاں رہے
اب دیکھیں کیا دکھائے نشیب و فرازِ دہر اب تک تو جس زمین ہیں رہے آسماں رہے
صیّاد ادھر خلاف اُدھر باغباں امیرؔ ہم بارِ خاطرِ قفس و آشیاں رہے

(۴۳)

ہر گنہگار کو ہے آس الٰہی تیری
عام ہے ہر صفتِ لامتناہی تیری
منزلیں ہوتی ہیں کھوٹی نکل اے قافلِ خلق
راہ تکتے ہیں کھڑے دیر سے راہی تیری
رنگ تو خوب ہے پر اے شبِ غم عیب یہ ہے
کہ روانی نہیں رکھتی ہے سیاہی تیری
حشر میں تو نہ زبان بند کرا اے تیغ دو دم
دو گواہوں کے برابر ہے گواہی تیری
بُو نہیں رنگ نہیں نور نہیں نار نہیں
معرفت کیوں نہ ہو دشوار الٰہی تیری
جوشِ وحشت میں رواں ہم جو کریں قلزمِ اشک
ابھی اے کوہ ہو چوٹی پہ ماہی تیری
ترے نظارے سے بڑھتی ہی بصارت اے زلف
سرمہ بن جاتی ہے آنکھوں میں سیاہی تیری
مشقِ فریاد دلا حشر میں کام آئے گی
کہ رکے گی نہ زباں وقتِ گواہی تیری

دھیان دِن کو نہیں تیرا فقط اے زُلفِ سیاہ
شب کو بھی آ کے دباتی ہے سیاہی تیری

داغ

نواب مرزا خان نام تھا اور داغ تخلص۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ شعر و سخن کی اصلاح کے لئے حضرتِ ذوق کے آگے زانوئے تلمّذ تہہ کیا۔ کئی برس تک دربار رام پور سے متعلق رہے۔ بعد میں نواب حیدر آباد دکن کے تلمّذ کی وجہ سے حیدر آباد جانا پڑا۔ وہاں انہیں ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ مِلتا تھا۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد میں ہی انتقال کیا۔

نواب داغ کو غزل پر بڑا عبور حاصل تھا۔ غزل میں کلام کی برجستگی سادگی جذبات اور تخیّل کی خوبی قابلِ ستائش ہے۔ جذبات اور واردات عشق کے رموز کو خُوب پیش کیا ہے۔ طرزِ بیان کی شگفتگی اور دلپذیری اُن کے کلام کے جواہر خاص ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُن کے پڑھنے کا انداز بھی بڑا دلکش تھا۔

مرزا داغ کے تین دیوان آفتابِ داغ۔ گلزار داغ اور

مہتاب داغ دستیاب ہوتے ہیں۔ ایک مثنوی فریاد داغ بھی اُن کی یادگار ہے۔

(۱)

اس جفا پر یہ وفا ہے کہ تمہارا شکوہ
دِل میں رہنے نہ دیا مُنہ سے نکلنے نہ دیا

شوق نے راہِ محبت میں اُبھارا لیکن
ضعف نے ایک بھی گرتے کو سنبھلنے نہ دیا

کسی صورت نہ بچا عشق کی رسوائی سے
کہ مُجھے نام بھی غیرت نے بدلنے نہ دیا

چھین لیتا اُسے میں حشر کے دن ضد کرکے
کیا کروں فرشتوں نے مجھے مچلنے نہ دیا

بزم اغیار میں اُس شوخ نے عیّاری سے
کیا ہی اعجاز کیا داغ کو چلنے نہ دیا

(۲)

ثبات بحرِ جہاں میں اپنا فقط مثال حباب دیکھا
نہ جوش دیکھا نہ شور دیکھا نہ موج دیکھی نہ آب دیکھا
ہماری آنکھوں نے بھی تماشا عجب عجب انتخاب دیکھا
بُرائی دیکھی بھلائی دیکھی عذاب دیکھا ثواب دیکھا
نہ دِل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین دیکھا نہ خواب آیا
خُدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

طرب ہیں جس سے ہے جانِ محزوں اُسی کو گردش وہی ہے پُرخوں
کہ چرخ زن مثلِ دورِ گردوں مدام جامِ شراب دیکھا
پڑے ہوئے تھے ہزاروں پردے کلیم دیکھو تو جب بھی غش تھے
ہم اُس کی آنکھوں کے صدقے جس نے وہ جلوہ یوں بے حجاب دیکھا
جو راہ میں تیری آکے بیٹھے وہ فکرِ دیر و حرم سے چھوٹے
کہ تیرے کوچے کے ساکنوں نے بہشت میں بھی عذاب دیکھا
یہ دِل تو اے عشق گھر ہے تیرا کہ جس کو تو نے بگاڑ ڈالا
مکاں سے تا لامکاں جو دیکھا تجھی کو خانہ خراب دیکھا
سرور و عیش و نشاط کیسے؟ بدل گئے رنگ ہی جہاں کے
سُنا نہ کانوں سے جو تھا ہم نے وہ آنکھوں سے انقلاب دیکھا
جو تجھ کو پایا تو کچھ نہ پایا یہ خاکداں ہم نے خاک پایا
جو تجھ کو دیکھا تو کچھ نہ دیکھا تمام عالم خراب دیکھا
شرابِ غفلت سے داغ غش تھے دکھائے غفلت نے کیا تماشے
کہ سوتے سوتے جو چونک اُٹھے مگر کوئی تم نے خواب دیکھا

(۳۱)

میں کیا کروں بلا سے جو تو مہرباں ہے اب
وہ دل کہاں ہے اب وہ طبیعت کہاں ہے اب

تم پارسا سہی مگر اتنا تو سوچ لو
کچھ دیکھ ہی لیا تھا جو دل بدگماں ہے اب
دو ظالموں میں لاگ ہوئی میرے واسطے
نا مہرباں وہ ہے تو فلک مہرباں ہے اب
سُن لو جو ہم بیان کریں پھر کہاں یہ بات
چلتی ہوئی ہمارے دہن میں زباں ہے اب
بیٹھے ہیں ہم بھی گوش بر آواز کہہ تو دو
آتا ہے جس کو آئے یہاں امتحاں ہے اب
کیا کیا ملائے خاک میں انسان چاند سے
سچ پوچھئے اگر تو زمیں آسماں ہے اب
اس کو بھی میری وجہ سے ہیں بدگمانیاں
جو ہم نشیں مرا ہے ترا پاسباں ہے اب

(۴۳)

اک چیز ہی اِس عالمِ ہستی میں بشر بھی
دُنیا کا طلبگار بھی دُنیا سے حذر بھی
یہ کان تک آئیگی بُری ہو کہ بھلی ہو
رُک جائیگی کیا تیری طرح تیری خبر بھی
بیتاب تری بزم میں دیکھا جسے دیکھا
ہوش اُڑنے میں ہے اُٹتی ہی اُٹتی ہی خبر بھی
جب جُرمِ محبت کی سزا ملگئی اک بار
تقصیر وہی ہم سے ہوئی بارِ دگر بھی

روندا ہے غضب لشکرِ غم نے مری دل کو — ایسی نہیں پامال کوئی راہ گذر بھی
ہوتی ہے دعا کافر و دیندار کی مقبول — اللہ کی سرکار میں لٹتا ہے اثر بھی
اچھا ہے کہ جنگل میں ہو پانی کا سہارا — لے جائے مرا نامہ رساں دیدۂ تر بھی

فرماتے ہیں وہ سنتے ہیں جب داغ کے اشعار
اللہ زباں دی تو زباں میں ہو اثر بھی

(۵)

پوشیدہ جب ہے راز کہ منہ میں زباں نہ ہو — ہم بات بھی کریں تو بغیر از فغاں نہ ہو
رکھنا ہماری خاک سے کچھ راہ اے صبا — مرقد میں بند سوزِ جگر کا دھواں نہ ہو
مارا نگاہِ ناز سے پہلے جگر پہ تیر — پھر اوس پہ حکم یہ ہے کہ لب پر فغاں نہ ہو
تم کو مزا نہ دیگی کبھی داستانِ عشق — جبتک ہماری منہ سے یہ قصہ بیاں نہ ہو
کہتے ہیں لوگ زیرِ زمیں جس کو آسماں — وہ کشتگانِ آتشِ غم کا دھواں نہ ہو
رکھتے ہیں کیا چھپا کے غمِ یار دل میں ہم — ڈر ہے کہ یہ نصیبِ دلِ دشمناں نہ ہو

تہمت کسی کو ظلم کی اے داغ کیوں لگائیں
شکوہ بتوں سے کیا جو خدا مہرباں نہ ہو

حالیؔ

خواجہ الطاف حسین نام اور حالیؔ تخلص تھا۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے۔ ابھی نو ہی برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا والدہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ابتدائی تعلیم مشرقی طریقے پر ہوئی سترہ برس کی عُمر میں شادی ہو گئی اور ملازمت کے سلسلہ میں دہلی پہنچے ابتدا میں حضرت شیفتہؔ سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے تھے۔ بعد میں مرزا غالبؔ کے تلامذہ میں شامل ہوئے۔ ضلع حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں بھی ملازمت کی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ذریعہ معاش کی تلاش میں پنجاب آئے، اور گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازم ہو گئے۔ یہاں پر اُنھوں نے مولانا آزاد کے ساتھ نئے مشاعروں کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد دہلی میں اینگلو عربک سکول میں بطور معلّم کے ملازمت اختیار کی، اور یہاں سے سرسیّد کی تحریک میں دلچسپی لینے لگے۔ ادبی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے شمس العلما کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ مولانا حالی نے ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

مولانا حالیؔ شاعری کے لحاظ سے جدید و قدیم کے سنگھم ہیں۔

اپنی عمر کے چالیس پنتالیس سال تک قدیم طرز میں غزلیں کہتے رہے مگر سرسیّد کے زیر اثر پُرانے طرز کو بدل ڈالا تھا۔ جدید غزلوں میں فرسودہ عاشقانہ خیال آرائی سے احتراز کیا ہے۔ اور اخلاق کو بیکار ذہنی تعیش پر ترجیح دی ہے۔ ان کی بیشتر نظموں کی زبان نہایت سیدھی سادی اور شُستہ ہے۔ مُسدّس حالی، یا مدوجزر اسلام ان کی معرکتہ الآرا نظم ہے۔ جس کا ترجمہ دُنیا کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مولانا حالی نے اُردو نظم میں قومی شاعری کی بُنیاد ڈالی۔ نثر میں بایوگرافی اور تنقید سے متعلق نہایت اچھی کتابیں لکھیں آپ کی نظم و نثر کی مشہور تصانیف دیوان حالی، مسدس، مثنویاں، حیات سعدی، یادگار غالب، حیات جاوید، اور مقدمۂ شعر و شاعری وغیرہ ہیں۔

(۱)

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگادو آگ کوئی آشیاں میں

کہیں انجام آپہنچا وفا کا
گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دِل پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

(۲)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

ہے دورِ جامِ اوّلِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اسقدر کہاں

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیان کسل و رنج و راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

حالی نشاط و نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں!

(۳)

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مرو کس کا ہے بدخشان و ختن کس کا ہے

دم سے یوسف کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیتِ حزن کس کا ہے

مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانئے یہ چرخِ کہن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذات خدا
ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کس کا ہے

آج کچھ اور دنوں سے ہے سوا استغراق
عزم تسخیر، پھر اے شیخ زمن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں رُوپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے

عشق اُدھر عقل اِدھر دُھن میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھئے دونوں میں کٹھن کس کا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اس کی
ولولہ تجھ میں یہ اے مُرغِ چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

اتنی ہی دُشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے

سامنا ہے موت کا ہونا محبت سے دوچار
آئے اس میدان میں زاہد اگر کچھ جان ہے

دیکھ اے بُلبُل ذرا گلبن کو آنکھیں کھولکر
پھول ہیں گر آن ہی کانٹے ہیں بھی اک شان ہے

عقل پھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی
لے نہ اب نام آدمیت کا، اگر انسان ہے

چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق
آدمی کا آدمی دُشمن، خُدا کی شان ہے

تجھ میں جوت اے شمع ہی کس برقِ عالم سوز کی
جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے

دِل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

(۵)

مرثیۂ غالب

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول
سَو تکلّف اور اس کی سیدھی بات

دل میں چبھتا تھا، وہ اگر بمثل
دِن کو کہتا تھا دِن اور رات کو رات

ہو گیا نقش دل پہ، جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اُس کے مرنے سے مر گئی دِلّی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی، تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اُس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دِل کو باتیں جب اسکی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دِل کو بہلائیں

کس کو جا کر سُنائیں شعر و غزل
کس سے دادِ سخن وری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائبؔ و اسیرؔ و کلیمؔ
لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط، مُنہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

اکبرؔ الہ آبادی

نام سید اکبر حسین رضوی اور اکبر تخلص تھا۔ ۱۸۴۶ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید تفضل حسین تحصیل بارہ میں نائب تحصیلدار تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ وحید الہ آبادی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے شروع میں اکبر بیس روپے ماہوار پر ملازم ہوئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ترقی کر کے ججی کے عہدے سے پنشن پائی۔ بعد میں گورنمنٹ نے جوڈیشل سروس کے صلے میں خان بہادر کا خطاب بھی دیا تھا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ ۱۹۲۱ء میں انتقال کیا۔
اکبر نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ مگر بعد میں طنزیہ اور ظرافت سے بھرپور اشعار کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ان کی شاعری کا ایک خاص رنگ تھا۔ ملک میں آزادی کے بڑھتے ہوئے جذبے کے تحت بدیشی تہذیب اور مغرب کی تقلید کی مخالفت میں شعر کہے۔ اُن کے کلام کی زبان نہایت صاف اور پاکیزہ ہوتی تھی اور طرز بیان نہایت دلکش۔ عاشقانہ رنگ کے اشعار میں جدّت کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا کلام اخلاق اور فلسفیانہ رموز کا حامل ہے۔ انگریزی الفاظ کو اپنے اشعار میں کمال عمدگی سے کھپایا ہے۔ بہت سے انگریزی زبان کے شعراء کے کلام کا اُردو میں نہایت خوش اسلوبی اور عمدگی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ انہیں ہر بحر اور ہر زمین میں شعر کہنے کا ملکہ حاصل تھا۔ اور اپنے طرز میں مسلّم الثبوت اُستاد مانے جاتے ہیں۔ آپ کا کلام چار دیوانوں میں شائع ہو چکا ہے۔

(۱)

شورِ بلبل، جوشِ گل، موجِ نسیم، انوارِ صبح اللہ اللہ! کس قدر ہیں دلکش آثارِ صبح

آفتابِ اوجِ سعادت کا ہے وہ روشن نفس — نورِ طاعت جس سے ظاہر ہو دمِ آثارِ صبح
جلوۂ حق کے مقابل روئے بت ہے بے فروغ — ہے پیامِ مرگ شمعوں کیلئے دیدارِ صبح
واہ کیا کہنا ہے تیرا اے نسیمِ صبح خیز — تیرے دم سے ہے چمن میں گرمئ بازارِ صبح
عاشقِ دُنیا کو کیوں آئے خیالِ آخرت؟ — کس نے پروانے کو پایا شائقِ دیدارِ صبح

عہدِ پیری آ گیا اکبر سنبھالو اپنے ہوش
خوابِ غفلت سے اٹھو پیدا ہوئے آثارِ صبح

(۳)

یہ طفلِ ناداں غریقِ غفلت ہوائے دولت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں
بہار ہی سے نہیں ہیں واقف، خزاں کے ظلموں کو کیا وہ سمجھیں
یہ داغ تو ہے انہیں کے دل پر جو محوِ رنگِ چمن رہے ہیں
نیا فلک ہے نئے ستارے یہ شوق سے کرتے ہیں نظارے
انہیں کو کچھ حس ہے گردشوں کا جو زیرِ چرخِ کہن رہے ہیں
رہے ہیں جو برگ و خس کے خوگر انہیں ہو کیوں خار اُنکا منظر
نگاہ تو ہے انہیں کی مضطر جو مستِ سرو و سمن رہے ہیں
اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھُپا ہے معنی کا چاند اکبر
مگر معانی ہیں ایسے روشن کہ نور کی طرح چھن رہے ہیں.

(۳۳)

دِلوں کو لذّتِ معنی کا اب حس بھی نہیں باقی
جسے دیکھو قتیلِ صورتِ دُنیائے فانی ہے

حدیثِ از روئے قربِ باری ہی نظر کس کی
خُدا اک لفظ ہے اور شوقِ موسیٰ اِک کہانی ہے

ہوائے وادیٔ ایمن کہاں اب گلشنِ دل میں
نہ وہ اَرِنی کا خرمن ہے نہ شوقِ لن ترانی ہے

معاذ اللہ! غفلت باریاں یہ ابرِ مغرب کی
کوئی آلودۂ آز کوئی مصروفِ خانی ہے

ہٹا دے اپنی ہستی اشتیاقِ حُسن باقی میں
جو اے اکبرؔ تجھے ذوقِ حیاتِ جاودانی ہے

(۳۴)

یہ موجودہ طریقے راہیٔ مُلکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زُلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دَورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے
نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں ،
نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیبِ رقم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملّت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنّی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال و سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دُنیا میں!
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
کسی کو اس تغیّر کا نہ حِس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

۵

ختم کیا صبا نے رقص، گُل پہ نثار ہو چکی
جوشِ نشاط ہو چکا، صورتِ ہزار ہو چکی

رنگِ بدِ زمانہ کو دیکھ کے گُل نے راہ لی
لُطفِ نسیم ہو چکا، کاوشِ خار ہو چکی

رنگِ بنفشہ مِٹ گیا، سنبلِ تر نہیں رہا
صحنِ چمن میں زینتِ نقش و نگار ہو چکی

مستیٔ لالہ اب کہاں؟ اس کا پیالہ اب کہاں
دورِ طرب گزر گیا، آمدِ یار ہو چکی

رُت وہ جو تھی بدل گئی، آئی بس اور نکل گئی
تھی جو ہوا میں نکہتِ مشکِ تتار ہو چکی

اب تک اُسی روش پہ ہے اکبرِ مست و بے خبر
کہدے کوئی عزیز من فصلِ بہار ہو چکی

(۶)

رُباعیات

دُنیائے دنی محلِ آفات بھی ہے
فکرِ روزی مخلِ اوقات بھی ہے
طرہ پھر اس پہ یہ کہ مرنا بھی ضرور
جینا رہے آدمی تو اک بات بھی ہے

دُنیا کرتی ہے آدمی کو برباد
انکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد
دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی
عقبےٰ کا تصوّر اور اللہ کی یاد

طاقت وہ جو باثر سُلطانی ہے
اُس جا ہے چمک جہاں زرافشانی ہے
تعلیم وہ خُوب ہے جو سکھلائے ہُنر
اچھی ہے وہ تربیت جو رُوحانی ہے

کھولی ہے زباں خوش بیانی کے لئے
اُٹھا ہے قلم گُہر فشانی کے لئے
آیا ہوں ہیں کوچۂ سخن میں اکبؔر
نظارۂ شاہدِ معانی کے لئے

چکبستؔ

برج نارائن نام اور چکبستؔ تخلّص تھا۔ ذات کے کشمیری پنڈت تھے۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے مگر چند ہی سال کے بعد لکھنؤ چلے گئے، اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد وکالت شروع کی۔ ۱۲۔ فروری سنہ ۱۹۲۶ء کو ایک مقدّمے کی پیروی کے سلسلے میں رائے بریلی گئے واپسی کے وقت اسٹیشن پر یکایک فالج کا حملہ ہوا،

زبان بند ہوگئی، اور رائے بریلی کے اسٹیشن پر ہی انتقال کیا۔

چکبستؔ نے سولہ سترہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا، اور ذوقِ شعر عُمر کے ساتھ ساتھ ترقّی کرتا گیا۔ آپ نے غزلیں مرثیے، رُباعیات سبھی کچھ کہا ہے۔ آپ کے ہر صنف کلام میں حب الوطنی اور قومی جذبہ نمایاں ہے۔ قدرتی مناظر کی تصویر کشی بھی خُوب کی ہے۔ واقعات کے نظم کرنے میں خوب صلاحیت رکھتے تھے۔ کلام سادگی اور صفائی سے خالی نہیں، اور تخیّل اور شوکتِ الفاظ خاص طور پر نمایاں ہے۔

چکبستؔ کی نظمیں 'صبح وطن' کے نام سے چھپ چُکی ہیں۔ وفات سے قبل ایک ماہوار رسالہ 'صبح اُمّید' آپ کی ادارت میں نکلتا تھا، ایک ڈرامہ "کملا" بھی آپ کی یادگار ہے۔ نثر میں تنقیدی مضامین لکھتے تھے، جو مضامین چکبست نامی کتاب میں شایع ہو چکے ہیں۔

(۱)

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریک درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا!

بہار آئی ترقّی پر ہے سودا دم بدم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا
لکھا یہ داورِ محشر نے میرے فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا
کہا غنچہ نے ہنس کر واہ کیا نیرنگ عالم ہے
وجودِ گل جسے سمجھے ہیں سب، وہ ہے عدم میرا
کشاکش ہے امید و یاس کی، یہ زندگی کیا ہے
الٰہی ایسی ہستی سے تو اچھا تھا عدم میرا
اگر کون و مکاں اک شعبدہ تھا اس کی قدرت کا
تو اس دُنیا میں آخر کس لئے آیا قدم میرا
دلِ احباب میں گھر ہے شگفتہ رہتی ہے خاطر
یہی جنّت ہے میری اور یہی باغ ارم میرا
کھڑی تھیں راستہ روکے ہوئے لاکھوں تمنّائیں
شہیدِ یاس ہوں نکلا ہے کس مشکل سے دم میرا
رہی ہے ایک ترکِ آرزو کی آرزو باقی
اسی پر ختم ہے افسانۂ درد و الم میرا
زبانِ حال سے یہ لکھنؤ کی خاک کہتی ہے

مٹایا گردشِ افلاک نے جاہ و حشم میرا
کیا ہے فاش پردہ کفر و دیں کا اس قدر میں نے
کہ دشمن ہے برہمن اور عدو شیخ حرم میرا

(۲)

زندگی تلخیٔ ایام کا افسانہ ہے
زہر بھرنے کے لئے عمر کا پیمانہ ہے

بے حجاب آج تری نرگس مستانہ ہے
اب جسے ہوش کا سودا ہے، وہ دیوانہ ہے

رُخ ہے ساقی کی طرف ہاتھ میں پیمانہ ہے
رہنما آج مری لغزشِ مستانہ ہے

آئی ہے لاش اُٹھانے کو نسیم سحری
چھوٹتا بعد فنا شمع سے پروانہ ہے

عالم یاس ہے دریا سے یہ کہتا ہے حباب
غیر سیراب ہیں خالی مرا پیمانہ ہے

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگ شباب
لب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

یادِ احباب گذشتہ پہ فدا رہتا ہے
دلِ ناشاد بجھی شمع کا پروانہ ہے

دل ہے مایوس کہ نیت نہیں ساقی کی درست
آنکھ کہتی ہے یہ شیشہ ہے وہ پیمانہ ہے

اک طرف جان ہے، پیمانِ وفا ایک طرف
امتحاں آج ترا ہمت مردانہ ہے

(۳)

شورشِ دیر و حرم سے جب پریشاں ہو گئے
کچھ سمجھ کر ہم شریک بزم رنداں ہو گئے

دیکھنا نیرنگ سازیٔ طلسم نوبہار
پیرہن کلیوں کے پھولوں کے گریباں ہو گئے

دردِ اُلفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

عطر افشاں ہیر ویرانے میں آئی ہے نسیم
کیا کسی محبوب کے گیسو پریشاں ہو گئے

رہ گئی بازارِ محشر میں گنہگاروں کی ساکھ
رحمتِ باری کے سکے داغِ عصیاں ہو گئے

اپنے دیوانوں سے ملنے کو چلی آئی بہار
سبزہ و گل صحنِ زنداں میں نمایاں ہو گئے

اس تمنا میں کہ آزادی کی دیکھیں گے سحر
ہم اسیرِ کلفتِ شب ہائے زنداں ہو گئے

حسن کی دولت سے نکلے گلہائے نورس بے خبر
دیکھ کر رنگِ چمن کانٹے نگہباں ہو گئے

جام تک جم سے شراب آنے میں ہو جاتی ہے دیر
ہم تو ساقی کے تکلف سے پریشاں ہو گئے

جن کی شورش کے لئے آغوشِ دنیا تنگ تھا
اشک کے قطرے وہ ان آنکھوں میں پنہاں ہو گئے

(۴۳)

مرثیہ بال گنگا دھر تلک

موت نے رات کے پردے میں کیا کیا وار
روشنی صبحِ وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار

معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بے کسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے،

اُٹھ گیا دولتِ ناموسِ وطن کا وارث　　　قوم مرحوم کے اعزازِ کہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی شہِ دکن کا وارث　　　پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث
تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

موت مہراشٹ کی تھی یا ترے مرنے کی خبر　　　مردنی چھا گئی انساں تو کیا پتھر پر
پتیاں جھک گئیں مرجھا گئے صحرا کے شجر　　　رہ گئے جوش میں بہتے ہوئے دریا تھم کر
سرد و شاداب ہوا رک گئی کہساروں کی
روشنی گھٹ گئی دو چار گھڑی تاروں کی

تھا نگہبانِ وطن دبدبۂ عام ترا　　　نہ ڈگیں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ تھا کام ترا　　　نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا
یاد کر کے تجھے مظلومِ وطن روئیں گے
بندۂ رسمِ جفا چین سے اب سوئیں گے

زندگی تیری بہارِ چمنستانِ وفا　　　آبرو تیری لئے قوم سے پیمانِ وفا
عاشقِ نامِ وطن کشتۂ ارمانِ وفا　　　مردِ میدانِ وفا جسمِ وفا جانِ وفا
ہو گئی نذرِ وطن ہستیٔ فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری نہ جوانی تیری

اوجِ ہمت پہ رہا تیری وفا کا خورشید　　　موت کے خوف پہ غالب رہی خدمت کی اُمید

بن گیا قید کا فرمان بھی رحمت کی نوید — ہوئے تاریکیٔ زنداں میں ترے بال سپید

پھر رہا ہے مری نظروں میں سراپا تیرا
آہ وہ قید ستم اور بڑھاپا تیرا

معجزہ اشک محبت کا دکھایا تو نے — ایک قطرہ سے یہ طوفان اٹھایا تو نے
ملک کو ہستیٔ بیدار بنایا تو نے — جذبۂ قوم کے جادو کو جگایا تو نے

اک تڑپ آ گئی سوتے ہوئے ارمانوں میں
بجلیاں کوند گئیں قوم کے ویرانوں میں

لاش کو تیری سنواریں نہ رقیبان وطن — ہو جبیں کیلئے صندل کی جگہ خاک وطن
تر ہوا ہی جو شہیدوں کے لہو سے دامن — دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیئے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

اقبالؔ

نام محمد اقبال اور اقبالؔ تخلص کرتے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد کشمیری تھے۔ جو کسی زمانہ میں کشمیر کو چھوڑ کر سیالکوٹ میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔

اقبالؔ ۱۸۷۵ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم، اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں ولایت چلے گئے اور میونخ (جرمن) یونیورسٹی سے ایران پر ایک تحقیقی مضمون لکھ کر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ولایت سے وکالت کی ڈگری بھی حاصل کی تھی، کچھ دنوں تک پروفیسر رہے۔ بعد میں سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کی، اور ۱۹۲۳ء میں سرکار نے سر کے خطاب سے سرفراز کیا۔

ڈاکٹر اقبالؔ ایک مفکر شاعر تھے۔ اور اُن معدودے چند شعرا میں سے ہیں جنہیں شہرت بقا کی سند اُن کی زندگی میں ہی مل گئی تھی۔ اُن کی شاعری مقصدی تھی۔ جہاں وہ ایک بڑے شاعر ہیں وہاں فلسفی اور رہبر بھی ہیں۔ اُن کی شاعری میں سوسائٹی کی اصلاح

قومیت کی ترغیب، کمزوروں اور بدحال لوگوں کی حمایت، مغربی تہذیب کی مخالفت، خود اعتمادی اور عمل پیہم کی تعلیم عام ہے۔ اس کے علاوہ شاعری میں رفعت خیال، جوش، حسن ادا اور سلاست و موسیقی اور شوخی کا رنگ نمایاں ہے۔

شروع میں آسان اُردو میں اشعار کہتے تھے۔ مگر بعد میں جوں جوں کلام میں فکر اور تخیل میں پرواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی، فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال کرنے لگے تھے۔ مگر بہت سی نظمیں بہت صاف اور سادہ ہیں۔ جن میں ہندی کے مانوس الفاظ بڑی خوبی سے نظم کئے گئے ہیں۔

آپ کی مشہور تصانیف بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم پیام مشرق۔ زبور عجم، اسرار خودی، رموز بے خودی۔ پس چہ باید کرد۔ ارمغان حجاز۔ ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات وغیرہ ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے سنہ ۱۹۳۸ء میں انتقال کیا۔

(۱)

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اُٹھیگا گفتگو کا
مری خموشی نہیں ہی گویا مزار ہے حرف آرزو کا
جو موج دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان میری

گہر یہ بولا صدف نشینی ہی مجھ کو سامان آبرو کا
نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جُو کا
کوئی دِل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنّا
الٰہی تیرا جہان کیا ہے! نگار خانہ ہے آرزو کا
کھُلا یہ مر کر کہ زندگی اپنی تھی طلسم ہوس سراپا
جسے سمجھتے تھے جسم خاکی، غبار تھا کوئے آرزو کا
اگر کوئی شے نہیں ہی پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنّا ہے، دل کو سودا ہے جستجو کا
چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا، اتنا بیدرد کیوں ہے انساں
تری نگاہوں میں ہی تبسّم شکستہ ہونا مرے سبُو کا
ریاضِ ہستی کے ذرے ذرے سی ہی محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گُل کو تُو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بُو کا
تمام مضموں مری پُرانے، کلام میرا خطا سراپا
ہُنر کوئی دیکھتا ہی مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جُو کا
سپاس شرطِ ادب ہے، ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھ کر
ذرا سا اک دِل دیا ہی وہ بھی فریب خوردہ ہی آرزو کا

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تُو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گُل سے قطرہ انسان کے لہو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رختِ سفر اُٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

جو گھر سے اقبال دُور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثال گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

(۲)

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گُزر گیا اب وہ دَورِ ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں مے خانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنون تھے، وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی. مگر نیا خار زار ہوگا

سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں
تو پیرِ میخانہ سن کے کہنے لگا کہ مُنہ پھٹ ہے، خوار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خُدا کی بستی دُکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنائے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا
چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو
یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دِل جلوں میں شمار ہوگا
کہا جو قمری سے میں نے اک دِن یہاں کے آزاد پابگل ہیں
تو غنچے کہنے لگے، ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا
یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دِل! گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا
نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا
نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا، ابھی وہی کیفیت ہے اس کی
کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

۳

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے
بجلیاں بے تاب ہوں جن کے جلانے کے لئے

وائے ناکامی فلک نے تاڑ کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لئے

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو مِلّت سے تری
ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لئے

دِل میں اپنے کوئی ایسی آرزو پیدا کروں!
لوٹ جائے آسماں میرے مٹانے کے لئے

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چُن کے تو
آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

پاس تھا ناکامئ صیّاد کا اے ہم صفیر
ورنہ میں اور اُڑ کے آتا ایک دانے کے لئے

اِس چمن میں مرغِ دِل گائے نہ آزادی کے گیت
آہ! یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

(۴)

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو
مآلِ حُسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو

متاعِ نُور کے لُٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو

زمیں سے دُور دیا آسماں نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اڑھائی قبائے زر تجھ کو

غضب ہے، تیری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تیری کانپتے گزرتی ہے

چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانوں میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

(۵)

فنونِ لطیفہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

(۶)

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہی وہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

"ساحرِ الموط" نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بےخبر سمجھا اسے شاخِ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خُوب چُن چُن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کیلئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائی سادگی سے کھا گیا مزدُور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمّتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیدارئ جمہور ہے، سامانِ عیش
قصۂ خوابِ آورِ اسکندر و جم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دورئ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کی تجلّی زار میں آباد ہو

فانی بدایونی

شوکت علی خان نام اور فانیؔ تخلّص تھا۔ ۱۸۷۹ء میں بمقام بدایون تولد ہوئے آپکے آباؤ اجداد شاہ عالم کے زمانے میں کابل سے دہلی آئے تھے۔ فانیؔ نے تیرہ برس کی عُمر تک عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اسکے بعد انگریزی پڑھنا شروع کی۔ بریلی کالج سے بی، اے پاس کیا، اور ۱۹۰۰ء میں علیگڈھ سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ کئی برس تک لکھنؤ میں وکالت کی۔ بعد میں حیدرآباد میں ملازمت اختیار کی۔

حضرتِ فانیؔ کو شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا چنانچہ آپنے پہلی غزل گیارہ برس کی عمر میں کہی تھی، اور بیس برس کی عمر میں پہلا دیوان مکمل کر لیا تھا لیکن وہ ضائع ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں دوسرا دیوان باقیاتِ فانی کے نام سے شائع ہوا جو نہایت

قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔

فانی کے کلام میں میر کی طرح یاس و حزن کی کثرت ہے، جس کی وجہ یہی تھی کہ اُن کی زندگی بھی مایوسی اور ناکامی کی ایک داستان تھی۔ اُن کے کلام میں جہاں مرزا غالب کی سی دشوار پسندی اور فلسفہ نگاری ہے وہاں ان کا اسلوب بیان غالب کے بخلاف بالکل سیدھا سادا ہے۔ وہ اپنے کلام میں عربی اور فارسی کے مغلق الفاظ کے استعمال سے احتراز کرتے ہیں، اور صفائی بیان اور روزمرہ کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ کسی نے یہ ٹھیک ہی کہا ہے کہ "فانی غالب کے دماغ اور میر کے دل کا مرقع ہیں"۔

(۱)

بیگانۂ اختیار ہو جا — راضی بہ رضائے یار ہو جا
جینے کو یہ آسرا بہت ہے — اچھا ہے اُمیدوار ہو جا
غیرت ہے تو غم کی جستجو کر — ہمت ہو تو بے قرار ہو جا
اے درد یہ چٹکیاں کہاں تک — اُٹھ اور جگر کے پار ہو جا

ماتم کدۂ وفا ہے عالم
فانی دلِ سوگوار ہو جا

(۲)

آ، ورنہ جانتا ہوں فریبِ نظر کو میں — دیکھوں اُلٹ کے پردۂ داغِ جگر کو میں
ہر نقشِ پا کو دیکھ کے دُھنتا ہوں سر کو میں — پہچانتا نہیں ہوں تری رہ گزر کو میں

عہدِ خزاں میں رفتۂ آشوبِ ہوش ہوں
بھولا ہوا ہوں موسمِ دیوانہ گر کو میں

گم کردہ راہ ہوں قدمِ اولیں کے بعد
پھر راہ بر مجھے نہ ملا راہ بر کو میں

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو
پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

مایوسِ انتظار ہوں مجنونِ اضطراب
ہنستا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں

بہلا نہ دل نہ تیرگیِ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

دو تین ہچکیوں میں دمِ نزع کر گیا
شرحِ درازِ زندگیِ مختصر کو میں

فانیؔ دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے
یعنی ابھی تو ڈھونڈ رہا ہوں اثر کو میں

(۳)

مری میت پہ اُن کا طرزِ ماتم کس بلا کا ہے
دلِ بے مُدّعا سے پوچھتے ہیں مدّعا کیا ہے

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارا ہی بہہ جائے تو دریا ہے

مری محرومیوں کا فیض ہے ہماری، رگ و پے میں
بدن میں جو لہو کی بُوند ہے خُونِ تمنّا ہے

غبارِ اشک خارستانِ حسرت یاس کے منظر
ہمارے دل کی دُنیا بھی کوئی دُنیا میں دُنیا ہے

نظر آتے ہیں دل میں آج پھر آثار بے تابی
ہم اے اُمّید سمجھے اس میں کچھ تیرا اشارا ہی
شبِ فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پُوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہی مزاجِ دِل تو اچھا ہی
یہ کیا کہنے ہو فانیؔ سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اُس ناکام کے دِل سے تو پوچھو زندگی کیا ہی

اصغر گونڈوی

اصغر حُسین نام اور اصغرؔ تخلّص تھا۔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ اصل وطن گورکھپور رہا۔ چونکہ آپکے والد گونڈہ میں قانونگو تھے اسلئے اصغر گونڈوی کہلائے ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ہوئی۔ بعد میں بھی کسی کالج یا سکول میں مستقل طور پر تعلیم حاصل نہ کی جو کچھ قابلیت پیدا کی وہ ذاتی مطالعہ کا نتیجہ تھی۔ شروع شروع میں شاعری میں منشی جلیل احمد و جگر بلگرامی سے اصلاح لیتے رہے بعد میں منشی امیر اللہ تسلیم کو بھی اپنی نظمیں دکھلاتے تھے۔

اصغرؔ کے ہاں واردات قلب و دماغ کی عُمدہ مصوّری ملتی ہی ان کی غزلوں کا مطالعہ ایک خاص کیف و مستی پیدا کرتا ہی۔ آپ کا کلام "نشاطِ رُوح" اور "سرودِ زندگی" نامی کتب میں چھپ چکا ہے۔

(۱)

موجوں کا عکس ہے خطِ جامِ شراب میں
یا خوں اچھل رہا ہے رگِ ماہتاب میں

باقی نہ تاب ضبط رہی شیخ و شاب میں
ان کی جھلک بھی تھی مری چشمِ پُر آب میں

کیوں شکوہ سنج گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حسن ہے
جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

میں اضطرابِ شوق کہوں یا جمالِ دوست
اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

(۳)

مے خانۂ ازل میں جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

اس رخ پہ ہے نظر کبھی جامِ شراب میں
آیا کہاں سے نورِ شبِ ماہ تاب میں

اقلیمِ جاں میں ایک تلاطم مچا دیا
یوں دیکھئے تو کچھ نہیں تارِ رباب میں

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے
ہے زندگی کا راز تلاشِ سراب میں

میں اس ادائے مست خرامی کو کیا کہوں
میری نظر تو غرق ہے موجِ شراب میں

اصغر غزل میں چاہئے وہ موجِ زندگی
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

حسرت موہانی

فضل الحسن نام اور حسرت تخلص کرتے تھے۔ سید اظہر حسن کے ہاں ۱۸۷۵ء میں بمقام موہاں ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں علی گڈھ محمڈن کالج سے بی، اے پاس کیا۔ شعر و سخن میں امیر اللہ تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے اور کلام میں حضرتِ مومن کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ملک اور قوم کی خدمت کا جذبہ طالب علمی کے زمانہ سے لیکر آخر دم تک رہا۔ چنانچہ زندگی بھر شعر و سخن اور علم و ادب کی خدمات کے علاوہ میدانِ سیاست میں ڈٹے رہے۔

اگرچہ حسرت نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر اُن کے جوہر غزل میں خُوب کُھلے ہیں۔ اپنے زمانے کے بہترین غزل گو شمار کئے جاتے تھے۔ غزلیں سوز و گُداز سے پُر ہیں۔ آپ کا کلام چُھپ چکا ہے۔ جو آپ کے پاکیزہ خیالات صحیح جذبات اور بلند تخیل کا اعلےٰ نمونہ ہے۔

آپ نے دیوانِ غالب کی شرح بھی لکھی جو آج بھی غالب پر لکھی گئی چند بہترین شرحوں میں سے ایک تصور کی جاتی ہے۔

حسرت موہانی نے ۷۵ برس کی عمر میں سنہ ۱۹۵۱ء میں انتقال کیا۔

(۱)

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حُسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

عشق روز افزوں پہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگین پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میری عشق کی بھی سادگی — جبکہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق — ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

تُو نے حسرتؔ کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

(۲)

کیسے چھپاؤں رازِ غم دیدۂ تر کو کیا کروں — دِل کی تپش کو کیا کروں سوزِ جگر کو کیا کروں؟
غیر ہیں گرچہ ہم نشیں بزم میں ہے تو وہ حسین — پھر مجھے لے چلا وہیں ذوقِ نظر کو کیا کروں؟
غم کا نہ دل میں ہو گزر وصل کی شب ہو یوں بسر — سب یہ قبول ہے مگر خوفِ سحر کو کیا کروں؟
دل کی ہوس مٹا تو دی ان کی جھلک دکھا تو دی — پر یہ کہو کہ شوق کی "بارِ دگر" کو کیا کروں؟

حسرتؔ نغز گو ترا کوئی نہ قدرداں مِلا
اب یہ بتا کہ میں ترے عرضِ ہنر کو کیا کروں

(۳)

روشِ حسنِ مراعات چلی جاتی ہے — ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے
اس جفا جو سے بایمائے تمنا اب تک — ہوسِ لطف و عنایات چلی جاتی ہے
ٹل ہی جاتے ہیں پشیمانیٔ غم کے اسباب — شوقِ فرماں کی مدارات چلی جاتی ہے
کچھ رہی تھی ہوسِ مے سو تغافل سے ترے — وہ بھی اے پیرِ خرابات چلی جاتی ہے
ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن — کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

اِس ستم گر کو ستم گر نہیں کہتے بنتا ... سعیِ تاویل خیالات چلی جاتی ہے
نگہِ یار سی پا لیتے ہیں دل کی باتیں ... شہرتِ کشف و کرامات چلی جاتی ہے
حیرتِ حسن نے مجبور کیا ہے حسرتؔ
وصلِ جاناں کی یونہیں رات چلی جاتی ہے

(۴)

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے ... دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا ... اور مجھے حاصل تھی لطفِ بے نہایت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے ... اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں ... یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
یاد ہیں وہ حسنِ الفت کی نرالی شوخیاں ... التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے
صحبتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

جگرؔ مُرادآبادی

علی سکندر نام اور جگرؔ تخلص ہے۔ ۱۸۹۰ء میں مُرادآباد میں پیدا ہوئے، آپ کے پردادا شاہ جہاں کے اُستاد تھے۔ جو عتاب شاہی کی وجہ سے ترک دہلی کے بعد مراد آباد میں سکون پذیر ہوئے۔ جگرؔ نے ذوقِ شعر وراثت میں پایا ہے آپ کے

داد اور والد اچھے شاعر تھے اور علی الترتیب نُور اور نظر تخلّص کرتے تھے۔

جگر نے مرزا داغ اور امیر اللہ تسلیم لکھنوی سے شرفِ تلمّذ حاصل کیا۔ آپ نہایت ملنسار اور منکسر المزاج ہیں۔ خلوص اور محبّت آپ کا طرّۂ امتیاز ہے۔ رندی اور مستی کے باوجود معتقدات ہیں پُورا یقین اور ایمان رکھتے ہیں۔

جگّر ویسے تو تمام اصنافِ سخن پر قُدرت رکھتے ہیں۔ مگر غزل اُن کی خاص جولانگاہ ہے۔ اور اپنی غزلوں کی وجہ سے خاص شہرت کے مالک ہیں۔ آپ کی غزلوں کی امتیازی خصوصیات انداز بیان کا بانکپن، شوخی اور مستی ہے بلند خیالات کو سادہ سے سادہ الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرنا آپ کا خاصہ ہے۔ حضرت جگّر کا پڑھنے کا انداز بڑا پُر کیف ہے۔

(۱)

عشق کی یہ نمود پیہم کیا
ہو تمہیں تم اگر تو پھر ہم کیا

جُز ترے کچھ نظر نہیں آتا
آرزو بن گئی مجسّم کیا

ترا ملنا ترا نہیں ملنا
اور جنّت ہے کیا جہنّم کیا

ان نگاہوں کے سب کرشمے ہیں
ورنہ یہ اضطراب پیہم کیا

موت کی نیند چھائی جاتی ہے
کہہ چکا ہیں فسانۂ غم کیا

ہمہ تن عشق بر ملا بن جا
درد کی اک صدائے مُبہم کیا

اس منظر میں نہیں سماتا کچھ
جان بیتاب و چشم پُرنم کیا

عشق خاموش کے مزے ہیں جگر
جوشِ فریاد و شورِ ماتم کیا

(۲)

بیتاب ہے، بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں

بے کیف مئے ناب ہے، معلوم نہیں کیوں
پھیکی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و باصرار
وہ جُرعہ بھی زہراب ہے، معلوم نہیں کیوں

بے نام سی اک یاد ہی کیا جانئے کس کی؟
بے وجہ تب و تاب ہے، معلوم نہیں کیوں

دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا
اب تک اثرِ خواب ہے، معلوم نہیں کیوں

خلوت میں بھی جلوت میں بھی گھیرے ہوئے دل کو
اک شعلۂ بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

کل تک تو یہی دُنیا سبدِ گُل تھی، مگر آج
بے رنگ ہے، بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر
میرے لئے بیتاب ہے، معلوم نہیں کیوں

جو ساز کہ خود نغمۂ عُریاں تھا اُسی کو
اندیشۂ مضراب ہے، معلوم نہیں کیوں

دل آج بھی سینہ میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے، معلوم نہیں کیوں

اس پردۂ رنگین پہ نظر آتا ہے جو کچھ
جیسے کہ یہ اک خواب ہے معلوم نہیں کیوں

(۳)

عشق نے توڑی سر پہ قیامت روزِ قیامت کیا کہئے
سُننے والا کوئی نہیں، رودادِ محبت کیا کہئے

دل ہے کسی کا رازِ حقیقت رازِ حقیقت کیا کہئے
جلوۂ حیرت مہر بہ لب ہے، جلوۂ حیرت کیا کہئے

جب سے اس نے پھیر لیں نظریں رنگ تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہئے

ایک تجلّی ایک تبسّم ایک نگاہِ بندہ نواز
اس سے زیادہ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا کہئے

شیشۂ دل ایک نازک ہستی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا
اس پہ کسی کے تیرِ ستم کی مشقِ سیاست کیا کہئے

جوش ملیح آبادی

شبیر حسین خان نام اور جوش تخلّص ہے سنہ ۱۸۹۴ء میں بمقام ملیح آباد پیدا ہوئے۔ آپ نے شعر و سخن کا ملکہ وراثت میں پایا ہے۔ فقیر محمد خان گویا آپ کے پردادا تھے۔ آپ کے دادا اور والد بھی خوش فکر شاعر تھے۔ آپ کے والد کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے آپ کی تعلیم و تربیت خاطر خواہ طریقے پر نہ ہو سکی۔ مگر تاہم اردو فارسی اور انگریزی کا بہت اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمے میں ملازمت کرتے رہے مگر وہاں کے جاگیر دارانہ نظام اور ماحول طبیعت کو راس نہ آئے اور دہلی آکر ایک بلند پایہ

ادبی رسالہ "کلیم" جاری کیا۔ لکھنؤ سے نیا ادب بھی نکالا اور بعد میں بمبئی میں فلم کمپنی میں ملازمت اختیار کی۔ آج کل گورنمنٹ آف انڈیا میں اردو رسالہ "آج کل" کی ادارت کے فرائض ادا کرتے ہیں۔

جوش کا شاعری کا ملکہ فطری ہے۔ ہر قسم کے سخن پر قدرت رکھتے ہیں مگر نئی وضع کی نظمیں خاص طور پر پسند خاطر ہیں۔ آپ کا کلام قومی جوش اور ولولے سے پُر ہے۔ آپ شاعر انقلاب بھی کہلاتے ہیں۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں جوش نے اپنی قومی نظموں کے ذریعے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ فطرت نگاری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ زبان و بیان کے بادشاہ ہیں۔ سماج میں اصلاح کی حمایت اور کلام میں بیباکی اور طنز کا گہرا اثر ملتا ہے سرمایہ داری کیخلاف آواز بلند کرنا اپنا فرض تصوّر کرتے ہیں۔ نظم کے علاوہ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ نثر میں تنقید سب سے زیادہ پسند خاطر ہے۔ آپ کی نظموں کے مجموعے سنبل و سلاسل، شعلہ و شبنم نقش و نگار، جنون و حکمت، فکر و نشاط، شاعر کی راتیں اور عرش و فرش کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔

(۱)
وطن

اے وطن پاک وطن رُوح روانِ احرار
اے کہ ذرّوں میں تری بوئے چمن رنگ بہار
اے کہ خوابیدہ تری خاک میں شاہانہ وقار
اے کہ ہر خار ترا روکشِ صد روئے نگار

ریزے الماس کے ترے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

پائی غنچوں میں تیری رنگ کی دنیا ہم نے
ترے کانٹوں سے لیا درسِ تمنا ہم نے
تیری نظروں سے سنی قرأت دریا ہم نے
تیرے ذرّوں سے پڑھی آیت صحرا ہم نے

کیا سنائیں کہ تری بزم میں کیا کیا دیکھا
ایک آئینے میں دنیا کا تماشا دیکھا

تیری ہی گردنِ رنگین میں باہیں اپنی
تیرے ہی عشق میں ہیں صبح کی آہیں اپنی

بانکپن سیکھ لیا عشق کی اُفتادوں سے
دل لگایا بھی تو تیرے ہی پری زادوں سے

پہلے جس چیز کو دیکھا وہ فضا تیری تھی
پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تیری تھی
پالنا جس نے ہلایا وہ ہوا تیری تھی
جس نے گہوارے میں چوما وہ صبا تیری تھی

اولیں رقص ہوا مست گھٹائیں تیری
بھیگی ہیں اپنی مسیں آب و ہوا میں تیری

اے وطن! آج سے کیا ہم ترے شیدائی ہیں
آنکھ جس دن سے کھلی تیرے تمنائی ہیں
مدتوں سے تری جلووں کے تماشائی ہیں
ہم تو بچپن سے ترے عاشق و سودائی ہیں

بھائی طفلی سے ہر اک آن جہاں میں تیری
بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری

حسن تیری ہی مناظر نے دکھایا ہم کو
تیری ہی صبح کے نغموں نے جگایا ہم کو
تیری ہی ابر نے جھولوں میں جھلایا ہم کو
تیری ہی پھولوں نے نوشاہ بنایا ہم کو

خندۂ گل کی خبر تیری زبانی آئی
تیرے باغوں میں ہوا کھا کے جوانی آئی

تجھ سے منہ موڑ کے منہ اپنا دکھائینگے کہاں
گھر جو چھوڑینگے تو پھر چھاؤنی چھائینگے کہاں
بزمِ اغیار میں آرام یہ پائینگے کہاں
تجھ سے ہم روٹھ کے جائیں بھی جائینگے کہاں

تیرے ہاتھوں میں ہے قسمت کا نوشتہ اپنا
کس قدر تجھ سے بھی مضبوط ہے رشتہ اپنا

اے وطن! جوش ہی پھر قوت ایمانی میں
خوف کیا دل کو سفینہ ہے جو طغیانی میں
دل سے مصروف ہیں ہر طرح کی قربانی میں
محو ہیں جو تیری کشتی کی نگہبانی میں

غرق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے
مسکراتے ہیں تیری ناؤ چلانے والے

(۲)

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب جو ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا
وہ سانولے پن پر میداں کے ہلکی سی صباحت دوڑ چلی
تھوڑا سا ابھر کر بادل سے وہ چاند جبیں جھلکانے لگا
لو ڈوب گیا بادل میں، بادل میں وہ خط لے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا
بادل میں چھپا تو کھول دئے بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں دریا کی طرح لہرانے لگا!
سمٹی جو گھٹا تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غُرفوں سے جو جھانکا گردوں کے امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے کہسار کا سر چکرانے لگا
پردہ جو اُٹھایا بادل کا دریا پہ تبسّم دوڑ گیا!
چلمن جو گرائی بدلی کی میداں کا دل گھبرانے لگا
اُبھرا تو بجلی دوڑ گئی ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
اُلجھا تو سیاہی دوڑا دی سُلجھا تو ضیا برسانے لگا
کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے کیا قید ہے کیا آزادی ہے
اِنسان کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

(۳)

موسیقی کا جزیرہ

کانپتی ہیں انگلیاں مطرب کی جب مستانہ وار
راگنی کی آنچ سے جب نرم ہو جاتے ہیں تار
عشق کا جب نبضِ آہن میں مچلتا ہے لہو
لحن کے سانچے میں جب ڈھلتی ہے دل کی آرزو
نغمۂ شیریں کا جب گرتا ہے رنگین آبشار
دل کو چھُو لیتی ہے اک موہوم سی باریک دھار
درد سے کھاتی ہیں جب موجیں ہوا کی پیچ و تاب
خود سے اُٹھ جاتی ہے جب سلمائے ماضی کی نقاب
دن ہی رہتا ہے نظر کے سامنے باقی نہ رات
ساز کے پردوں میں چھُپ جاتی ہے ساری کائنات

لے ہیں زلفوں کی طرح جس وقت لہراتا ہے دل
اک جنوں پرور جزیرہ میں پہنچ جاتا ہے دل
رُوح ہوتی ہے جہاں اس گم شدہ شے سے دوچار
جس کے کھو جانے سے میری زندگی تھی سوگوار
پھر بھی پانے کی طرح اس چیز کو پاتا نہیں
شکل سے پہچانتا ہوں، نام یاد آتا نہیں

ALLAMA IQBAL LIBRARY
45010

(۴)

رُباعیات

با حالِ غم، انسان ہوا جاتا ہے
بے چارہ پریشاں ہوا جاتا ہے
گھٹتا ہے تو آتا ہے فرشتوں کا جمود
بڑھتا ہے تو شیطاں ہوا جاتا ہے

ہم غنچۂ گیتی کو مسل دیتے ہیں
سر بخشش قدرت کا مسل دیتے ہیں
ہم سے تو شریف تر ہیں بےجاں درخت
ہم لیتے ہیں قیمت اور وہ پھل دیتے ہیں

انصاف! بتوں کی چاہ دینے والے
حُسن ان کو، مجھے نگاہ دینے والے
کس مُنہ سے مجھے حشر میں دیگا تعزیر
دل کو ہوسِ گناہ دینے والے

(ختم شد)

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY
No. 45010
Date. 3.1.63

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN.